نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوجاتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا۔

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ ہمشماہی تین روپیہ (مے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ آٹھ روپیہ (مے) سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد (۲۹)	فہرست مضامین اپریل ۱۹۳۶ء	شمار (۴)

ملاحظات ——— ۲

س ش ص ——— وصی احمد بلگرامی - بی - اے ——— ۹

چین وجاپان کی مخاصمت ——— عبدالرحیم بشتی ——— ۳۹

بیوہ اور اس کا اکلوتا بیٹا ——— عبدالقدیر خاں - میرٹھ کالج - میرٹھ ——— ۴۰

ازدواج ——— ابوسعید بزمی ایم - اے ——— ۴۸

مکتوبات نیاز ——— ۵۴

عہد حاضر کے سیاسیات میں پٹرول کی اہمیت ——— ۵۶

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام ——— ۵۹

باب الاستفسار ——— ۶۹

مطبوعات ——— ۷۲

اعتبارات ——— ۷۹

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد (۲۹)	اپریل سنہ ۳۶ء	شمار (۴)

ملاحظات

خود نمائی خدا شناسی نہیں است!

ہمارے علماء ہمارے قایدین ملت، اور ہماری جماعت کے وہ تمام افراد جو محراب و منبر کی بلندی سے صدائے موعظت بلند کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگر ان سب کی پند و نصیحت میں کوئی چیز "قدر مشترک" کی حیثیت سے نظر آتی ہے تو صرف یہ تعلیم کہ مسلمان اسوقت تک صحیح مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے نہ ہٹے۔ لیکن یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس سے کیا مقصود ہے؟

ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تلقین کے سلسلہ میں سب سے پہلے "خیر القرون قرنی" کی تصویر اُن کے سامنے آتی ہوگی اس کے بعد صحابہ کا دور پیش نظر ہوتا ہوگا اور پھر تابعین و تبع تابعین کا۔ لیکن آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ وہ عہد نبوی کو تاریخ انسانی کا کیوں بہترین دور قرار دیتا ہے تو وہ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ بتا سکے گا کہ اسوقت صدائے توحید بلند ہو رہی تھی، صنمکدے ویران کئے جا رہے تھے، لوگ خشوع و خضوع سے نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور محض رسول اللہ کا دیدار ہی نجات کے لئے کافی تھا

اس کے بعد وہ دور صحابہ کی برکات کا ذکر کرے گا، کیونکہ یہ زمانہ عہد نبوی سے زیادہ قریب تھا۔ پھر وہ تابعین کے زمانہ کی تعریف کریگا اور صرف اس بنا پر کہ اس عہد کے لوگوں نے صحابہ کو دیکھا تھا اور پھر تبع تابعین کا ذکر کریگا کیونکہ انھوں نے تابعین سے فیض صحبت حاصل کیا تھا۔ الغرض ایک مولوی کے سامنے وقت و زمانہ کی خوبی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ وہ عہد رسول اللہ سے قریب تر واقع ہو، اور اس کے بدترین ہونے کی صورت یہ ہے کہ عہد نبوی سے اس کا بہت زیادہ بُعد ہو گیا ہو۔ چنانچہ دنیا جتنی آگے بڑھتی جائے گی اتنی ہی خراب ہوتی جائے گی۔ — پھر حیرت ہے کہ جب ایک زمانہ کی سعادت و عدم سعادت صرف اس پر منحصر ہے کہ وہ کسی مخصوص انسان سے قریب واقع ہے یا دور، ہم پیچھے ہٹ کر کیا فایدہ حاصل کر سکتے ہیں بلکہ وہ ہستی کسی طرح واپس نہیں آسکتی اور ہم صرف اس کے دیار سے دوزخ اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتے۔

میرا مقصود اس تمہید سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے جو تدابیر قایدین مذہب کی طرف سے بتائی جاتی ہیں وہ مغفلانہ خواہ کتنی ہی شاندار و امید افزا کیوں نہ ہوں لیکن معنائً سرتاسر لغو و مہمل ہیں۔ ایک واعظ صدائے توحید کا ذکر کرتا ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کو ایک کہدینے سے انسان کو کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے۔ وہ کفر و بت پرستی کے استیصال کا کارنامہ نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے مگر میں نہیں سمجھ سکتا کہ پتھر کی چند مورتوں کو توڑ دینا کیوں انسانیت کا منتہائے ترقی قرار دیا جائے، وہ نماز و روزہ کی متقشرانہ کیفیت کا فسانہ دہراتا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ جنبش اعضاء کی چند مقررہ صورتیں اور فقر و فاقہ کی تنگی کو کیوں سعادت انسانی سمجھا جائے، وہ صرف رسول اللہ کے دیدار کو کافی ذریعۂ نجات قرار دیتا ہے، درانحالیکہ رسول کے دیکھنے والے اگر ایک طرف ابوبکر و علی تھے تو دوسری طرف بوجہل و بولہب بھی پائے جاتے تھے، گویہ فرق ضرور تھا کہ جنھوں نے اخروی نجات حاصل کی انہیں شاید جذبۂ صنم پرستی موجود تھا اور جو گمراہ کہلائے وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مجھ سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بہتر زمانہ کونسا تھا تو میں بھی بلا تامل عہد نبوی کا نام لے دونگا لیکن اس کا تعلق نہ رسول اللہ کی ذات سے ہوگا نہ اُن کے دیدار سے بلکہ صرف اُس روح سے جو اس انسان کامل نے پیدا کی اور اُس عزم و ارادہ سے جس نے ایک پست و جاہل قوم کو دفعتہً قعر مذلت سے نکال کر بام ترقی پر پہونچا دیا۔

یقیناً رسول اللہ نے توحید کا درس دیا لیکن اس سے مراد محض خدا کو ایک کہنا یا سمجھنا نہ تھا کیونکہ صرف یہ عقیدہ انسانی ترقی یا فلاح کو مستلزم نہیں بلکہ اس سے مراد ایک عام جذبۂ اتحاد و اخوت کو بیدار کرنا تھا، تمام نوع انسانی کو ایک سررشتۂ اجتماعیت سے وابستہ کرنا تھا اور اُس قوت برتر و اعلیٰ میں ضم ہو کر جو یقیناً ہر ہر ذرہ میں کارفرما ہے، ایک ایسی جمیل فضا پیدا کر دینا تھا جہاں خدا سمٹ کر انسان اور انسان پھیل کر خدا بن جاتا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ نے کفر و بت پرستی کے خلاف پوری جد و جہد سے کام لیا لیکن کفر سے مراد خودی کا انکار تھا انانیت کبریٰ سے اعراض تھا اور بت پرستی نام تھا اس کورانہ تقلید یا جاہلانہ سرنگونی کا جو ایک انسان سے احساس انسانیت و برتری چھین لینے والی ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ سرکار نبوت سے طاعت و عبادت کی بھی ہدایت کی گئی لیکن اس کا مطمح نظر صرف اس قوت کو سراہتا تھا جو نظام کائنات کو تکمیل و تجمیل کی طرف لیجا رہی ہے اور اس سے کسب فیضان کر کے خود اس قوت کا دست و بازو بن جانا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین پر سر ٹیک دینے سے نہ خدا کے مرتبہ میں کوئی بلندی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس عجز و فروتنی کی اسے ضرورت۔

الغرض یہ بالکل صحیح ہے کہ عہد نبوی بہترین زمانہ تھا لیکن اس کا تعلق نہ صرف روزہ و نماز سے تھا نہ ظاہری مراسم نیایش و عبودیت سے، نہ زبانی تسبیح و تہلیل سے اسے کوئی واسطہ تھا، نہ مسواک و مصلی سے بلکہ وہ ایک زمانہ تھا جس نے سوتی ہوئی انسانیت کو جگایا، جس نے فطرت کے فواے کا منہ کو انسان کے لئے بے نقاب کیا اور جس نے نوامیس الٰہیہ کو دسترس انسانی سے قریب تر کر کے علم کی ذہنیت کا رخ بدل دیا۔

پس یقیناً وہ عہد نہایت مبارک عہد تھا جب آفتاب حقیقت نے اول اول اس طرح طلوع کیا اور لاریب وہ زمانہ سراہے جانے کے قابل ہے جب شاہد مقصود سب سے پہلے برافگندہ نقاب سامنے آیا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ دعوے کرے کہ اس ابتدا کو کسی انتہا کی ضرورت نہ تھی، یہ آغاز انجام سے بے نیاز تھا، اس آفتاب کا طلوع نصف النہار سے مستغنی تھا، تو یقیناً اس کا دعویٰ غلط ہوگا، کیونکہ دنیا کا کوئی تخم دفعتہً بارآور نہیں ہو سکتا کوئی تعمیر فوراً استوار نہیں ہوتی اور منزل تک پہونچنے کے لئے قطع سفر ضروری ہے رسول اللہ نے بیشک انسانیت کے دور جدید کی بنا قدیم کی لیکن اس توقع کے ساتھ کہ آیندہ نوع انسانی اس کو عروج و کمال تک پہونچائے اور خدا کا وہ وعدہ جو "جنات عدن" کی صورت میں کیا گیا تھا پورا ہو کر رہے۔

پھر اب دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو کس قوم نے اس رمز کو سمجھ کر ان مدارج استعلا کو طے عمل کیا جو ایک سچے مومن و مسلم کے لئے مخصوص ہیں اور وہ کونسی قوم ہے جو اس تعلیم کو نظر انداز کر کے "ہل یہلک الا القوم الفاسقون" کی تعزیر میں مبتلا ہوئی۔

یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ ہم خدائی فیصلوں اور ربانی اصول میں ملک و ملت، رنگ و نسل، کفر و اسلام کی تفریق کو سامنے رکھ کر خطا و صواب کا معیار قایم کرتے ہیں۔ جو فطرت مشرق میں جلوہ گر ہے وہی مغرب میں ہے، قدرت کی جو کارفرمائیاں شمال میں نظر آتی ہیں وہی جنوب میں بھی ہیں۔ شاہراہ صرف ایک ہی ہے جس کا دوسرا نام دین فطرت ہے اور یہ سب کے لئے یکساں کھلی ہوئی ہے یہود و نصاریٰ کا فر و مسلمان کی تفریق صرف ہماری بے بصری کا نتیجہ ہے اور یہ نام وہ ہیں جو خدا کی لوح محفوظ یعنے صحیفۂ قدرت کے اوراق میں کسی جگہ نظر نہیں آتے، وہاں ان سب کو صرف ایک ہی نام لفظ "انسان" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کے لئے صرف ایک ہی پہچان "کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام" کی بتائی گئی ہے اور یہ فخر صرف بانی اسلام ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی نے اس راز کو ظاہر کیا اور اس طرح اس نے اول اول جملہ افراد نوع انسانی کو ایک ہی منزل کی طرف قدم بڑھانے اور ایک ہی مرکز پر جمع ہونے کی تعلیم دی۔ لیکن ہماری کوتاہ فہمیوں کی یہ داستان کتنی دردناک ہے کہ جس قوم پر سب سے پہلے اس راز کا افشا کیا گیا اسی نے سب سے زیادہ اس کو ٹھکرایا اور انسانیت کو جس جماعت سے سب سے زیادہ "توقع داد یا" نے کی تھی وہی سب سے زیادہ "خستۂ تیغ ستم" نکلی۔

اب سے اربوں سال قبل جس کرۂ ارض کی تخلیق ہوئی تھی ہرچند وہ ہنوز تشنۂ تکمیل ہے، لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ اسکے شباب و بلوغ کا زمانہ آرہا ہے، اس کی تحسین و تجمیل آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی ہے اور اس شراب کے رسا ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ علوم و فنون کے چشمے ہر طرف ابل رہے ہیں، کائنات کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے جا رہے ہیں، قدرت کے جملہ برکات ہمارے لئے عسیر الحصول ہوتے جاتے ہیں، عناصر عالم نے انسان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا ہے، "استخلاف فی الارض" کا وہ وعدۂ ربانی جو یوم الست میں کیا گیا تھا بہت جلد پورا ہونے والا ہے اور دنیا ایک زمانہ دراز تک انتظار کے جہنم میں پھنکنے کے بعد قرب و وصال کی فردوس سے ہم آغوش ہونے والی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سعادت و برکت ان کے لئے مقسوم نہیں ہے جنھوں نے دنیا کو "سجن المومن" سمجھ کر اس کو ٹھکرا دیا بلکہ اُن خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس قید خانہ کو اپنے لئے رشک فردوس بنا لیا خواہ اس کا نام آپ "جنت الکافر" ہی کیوں نہ قرار دیں۔

انسان اسی دنیا کا ایک جزو ہے اور اسی کو آباد کرنے کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ قدرت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ یہاں مفلوج و عاجز، بیکس و مفلس، نادار و ناچار، محتاج و بیمار بنکر زندگی بسر کرے۔ دنیا خدا کا ایک باغ ہے جس کو اس نے پھولنے اور پھلنے کے لئے نصب کیا تھا نہ کہ ویران و برباد ہونے کے لئے۔ پھر جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ موسم بہار کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں، دور خزاں ختم ہو چلا ہے، تازہ کونپلیں پھوٹ رہی ہیں گلہائے رنگا رنگ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہے ہیں اور بہت جلد خود ذات ربانی اُس کمسوت نشاط و جمال میں ڈھونما ہونے والی ہے جسے دست انسانی نے اپنے خالق کے لئے طیار کیا ہے۔ خدا غنی ہے اور وہ اس کا تہماق نہیں ہو سکتا جو محتاج و مفلس ہے۔ خدا غالب و قدیر ہے اس لئے وہ مغلوب و مفتوح کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ خدا پاکیزہ و طاہر ہے اس لئے وہ کثیف و بدسلیقہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا خدا اجمل و اکمل ہے اس لئے وہ ناقص و بدصورت سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اسے مکمل دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے نقص سے نفرت ہے، بدصورتی سے احتراز ہے، حزن و ملال سے استکراہ ہے۔ اور اس لئے وہ قومیں جو درماندہ و عاجز ہیں، مغموم و ملول ہیں، یقیناً وہی ہیں جن کی طرف سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا ہے اور جو قومیں غالب و فاتح ہیں، مسرور و شادکام ہیں، بیشک وہی ہیں جن سے خدا خوش ہے اور جن کو وہ دوست رکھتا ہے۔

اس دنیا میں ایک تشاءم (Pessimistic) قوم کو زندہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، وہ جماعت جو اپنی کاہلی اور قوت عمل کے فقدان کو "تقدیر و توکل" کے نام سے موسوم کر کے گدایانہ زندگی بسر کر رہی ہے وہ یقیناً ہلاک ہو کر رہیگی اور اسے ہلاک ہو جانا چاہئے۔ دنیا فطرت کا وہ کارنامہ ہے جس میں اس کی انتہائی تمنائے نشاط صرف ہو رہی ہے اور اس لئے ایک حزین و مایوس ہستی کا اس میں گزر نہیں۔ باغ کے وہ تمام پودے جو بیمار ہو کر مضمحل ہونے لگتے ہیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے صحیح و توانا درخت متاثر نہ ہوں۔ بالکل اسی طرح وہ جماعتیں بھی فنا ہو جائیں گی جن کے قوا مضمحل، جن کے دماغ ضعیف اور جن کی ذہنیتیں بیمار ہیں تاکہ خدا کی یہ کھیتی لہلہا اُٹھے اور اس کی زمین تمام خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔

چند دن سرزمین جاورہ میں

مارچ کا زیادہ حصہ سفر میں گزرا اور ہر چند حالات کے لحاظ سے اس کی ابتدا میرے لئے خوشگوار نہ تھی، لیکن اس کی انتہا بعض ایسے حیرت انگیز انکشافات پر ہوئی کہ اگر میں ان چند ایام کو اپنی زندگی کے بہترین حصہ سے تعبیر کروں تو غالباً نادرست نہ ہوگا۔

سرزمین جاورہ سے میری واقفیت کا آغاز اس زمانہ سے ہوتا ہے جب میں بھوپال میں مقیم تھا۔ صاحبزادہ صفدر علی خانصاحب کا عرصہ سے اصرار تھا کہ میں ایکبار جاورہ جاؤں اور مجھے اسی بنا پر انکار کہ رؤسا و امرا کی محفل میں مجھ ایسے گدائے متکبر کا کیا کام۔ لیکن آخر کار ان کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا اور ۲۱ء میں مجھے وہاں سب سے پہلے جانے کا اتفاق ہوا۔

ہر چند میرا قیام وہاں چار دن سے زاید نہیں رہا اور وہ بھی مہمان خانہ میں جو شہر سے کافی دور ہے، تاہم قلت زمانی و بعد مکانی کے موانع میری راہ جستجو میں حایل نہ ہو سکے اور میری نگاہ نے بہت جلد یہاں کے اُس تنہا جوہر تابندہ کو پہچان لیا جو اُسوقت بھی سلطنت کا دست راست تھا اور اب بھی ہے[1]۔ خود فرمانروائے جاورہ سے تبادلۂ خیال کا موقعہ تو مجھے نہیں ملا لیکن جو حالات مجھے وہاں معلوم ہوئے اُن سے میں نے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ اپنی اہلیت و صلاحیت کے لحاظ سے وہ یقیناً اُن کارفرما ہستیوں میں سے ہیں جن کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

خزانے را بہا رے میتواں کرد

اس کے بعد صاحبزادۂ صفدر علی خاں صاحب بھی وہاں سے چلے گئے اور میں بھی اپنے مشاغل و افکار میں مبتلا ہو کر اس دلچسپ خواب کو بھول گیا۔ زمانہ گزرتا گیا، سال پر سال ختم ہوتے رہے، یہاں تک کہ میں لکھنؤ چلا آیا اور اس کا امکان بھی باقی نہ رہا کہ میں اس زندگی میں پھر کسی وقت مالوہ کے اس مختصر مگر خوبصورت قطعۂ زمین کو دیکھ سکوں گا۔

لکھنؤ آنے کے بعد نگار نے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو ذہنی انقلاب پیدا کیا اور اصنام مذہبی پر جیسی کاری ضربیں لگائیں وہ اہل ملک سے مخفی نہیں۔ وہ کونسا ہنگامہ دار و گیر تھا جو برپا نہ ہوا، وہ کونسی لعنت تھی جس کا مستحق مجھے نہ قرار دیا گیا۔ وہ کونسا تیر ملامت تھا جو مجھ پر صرف نہ کیا گیا۔ قدامت پرستوں کی گالیاں، مولویوں کی پھٹکاریں، صوفیوں کی بددعائیں، مذہبی دیوانوں کی گریباں گیریاں الغرض وہ سب کچھ جس کا مظاہرہ جہل و بطلان کی طرف سے ہمیشہ علم و حقیقت کے مقابلہ میں کیا گیا ہے میرے مقابلہ میں بھی کیا گیا اور ممکن تھا کہ میں ان باغیانِ حق و صداقت کے غضبناک انتقام سے جانبر نہ ہو سکتا اگر یہ محسوس نہ کرتا کہ جو آواز میں نے بلند کی ہے اس کے سننے والے بھی دنیا میں موجود ہیں اور جو چنگاری میں نے خرمنِ جہل میں ڈالی ہے اس کے ہوا دینے والے دامنوں کی بھی یہاں کمی نہیں۔ چنانچہ منجملہ اُن چند ہستیوں کے جنھوں نے میرے اس اقدام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ایک بالغ نظر ہستی جناب صاحبزادہ محمد سرفراز علی خاں کی بھی تھی اور یقیناً میری زندگی میں یہ بالکل پہلا تجربہ تھا کہ ایک قصر امارت میں پرورش پانے والے انسان کو میں نے اس درجہ روشن دماغ و آزاد خیال پایا ہو۔

---

[1] خان بہادر صاحبزادہ محمد سرفراز علی خاں چیف سکریٹری دربار جاورہ۔

اس کے بعد مراسلت کے ذریعہ سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہا، دو دل جو ایک ہی عنصر سے خمیر ہوئے تھے ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے، دو روحیں جنھوں نے ایک ہی روشنی میں آنکھ کھولی تھی ایک دوسرے سے قریب ہوتی گئیں، اُدھر بارشِ لطف و کرم تھی اور ادھر نیایشِ نارسا، اُس طرف سیلِ محبت و خلوص تھا اور اس طرف اعترافِ بے ریا۔ الغرض میرے پاؤں اُکھڑ گئے اور میں بیتابانہ اس آستانِ محبت پر پہونچ گیا جہاں اس سے قبل ہی مجھے سجدہ ریز ہونا چاہیئے تھا۔ اس مرتبہ جاوا میں میرا قیام غیروں کی طرح مہمان خانہ میں نہیں بلکہ خود صاحبزادہ صاحب کی کوٹھی میں تھا، اور میری پرسشِ حال کے لئے معمولی خدام نہ تھے بلکہ خود معزز میزبان کی نگاہِ لطف و عنایت تھی کہ اگر میں باندازۂ احساس اس گرانباری کرم کا اظہار کرنا بھی چاہوں تو ممکن نہیں۔

صاحبزادہ صاحب موصوف ہر چند اس لحاظ سے بھی کہ وہ وزارت کے عہدہ پر ممتاز ہیں نیز اس حیثیت سے کہ وہ فرمانروا کے بھائی ہیں خاص اعزاز و مرتبہ کے حامل ہیں، لیکن میرے لئے ان کی جو خصوصیت باعثِ کشش ہے وہ صرف ان کی بلند انسانیت ہے جو دنیا کے ہزاروں ظاہری و مادی امتیازات سے کہیں اشرف و اعلیٰ چیز ہے۔ میرے قیام کے دوران میں ایک دن شام کو خود ہز ہائنس[1] بھی تشریف لائے اور اس طرح میری وہ تمنا بھی پوری ہو کر رہی جس کی تکمیل کے لئے اس عالم اسباب میں انتہائی کاوش کیجاتی ہے۔ ہز ہائنس کو میں نے کامل تیرہ سال کے بعد دیکھا لیکن میں نے ان کی صحت و توانائی میں مطلقاً کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ وہی افغانیوں کا سا پُر شہامت انداز، وہی دلیرانہ وقار، وہی چہرہ کے آثار خوشدلی اور وہی سُرخ و سفید رنگ جو پہلے تھا اب بھی موجود ہے۔ اس وقت ہز ہائنس گاؤن کے لباس میں تھے اور کھیل سے فارغ ہونے کے بعد سیدھے اسی طرح تشریف لے آئے تھے۔

ہز ہائنس نے جن الفاظ میں میری پزیرائی فرمائی ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں اور نہ اس نوع کے اسبابِ افتخار کا اظہار مناسب اس قدر کہدینا غالباً کافی ہوگا کہ یہ ملاقات شاہ و گدا کی نہ تھی بلکہ دو ایسے انسانوں کی تھی جو ایک پاکیزگیِ اخلاق کا مجسمہ تھا اور دوسرا وہ جو دنیا میں صرف اسی چیز کا پرستار رہے۔

رئیسوں کی جماعت کے متعلق میرے تجربات اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ میں ان کو اس دنیا کی مخلوق سمجھتا ہی نہیں اور مشکل سے کبھی یہ توقع کر سکتا ہوں کہ وہ سطحِ انسانی پر آکر کوئی بات سوچ سکتے ہیں، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ہز ہائنس کی زبان سے وہ الفاظ سنے جو صرف ایک ایسے نقاد کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں جس نے اوروں سے زیادہ اپنی ذات کا مطالعہ کیا ہے۔

رئیسوں کے مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اُن کی ذمہ داریاں اور ضروریات خود اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ ملک کے مختلف پبلک اداروں کی طرف توجہ نہیں کر سکتے۔ اس کا جواب جس تہذیب و شائستگی اور صاف گوئی کے ساتھ ملا وہ مجھے سخت حیرت میں ڈالنے والا تھا۔ ارشاد ہوا کہ "معاف فرمائیے میں آپ سے اس باب میں متفق نہیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ رئیسوں کی تعلیم ہی اسد ربہ ناقص ہوتی ہے کہ ان میں نہ احساسِ فرض شناسی پیدا ہوتا ہے اور نہ امتیازِ حسن و قبح اور نہ اپنا وقت صرف کرنے میں وہ قوتِ تمیز سے کام لے سکتے ہیں نہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دولت کا صحیح مصرف کیا ہے"۔ اسی سلسلہ میں نواب صاحب حشمت الیر نے اپنے زمانۂ تعلیم

[1] ہز ہائنس میجر فخر الدولہ صولت جنگ نواب سر افتخار علی خان بہادر کے۔ سی۔ آئی۔ ای

ڈیلی کالج اندور کے بعض نہایت دلچسپ واقعات سنائے اور دیر تک اس امر پر اظہار تاسف فرماتے رہے کہ امرا اپنی حقیقی ذمہ داریوں سے ناواقف رہکر نظام حکومت اور رعایا کے درمیان ایک زبردست خلیج حایل کر دیتے ہیں ۔۔۔ ہز ہائنس جس اصول پر حکمرانی کر رہے ہیں وہ خود انھیں کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ فرمانے لگے کہ "میں نے تین عہد کئے ہیں اور سختی سے میں ان کا پابند ہوں۔ ایک یہ کہ میں کسی کی غیبت نہیں کرتا، دوسرے یہ کہ کبھی کوئی بات غلط نہیں کہتا اور تیسرے یہ کہ انصاف کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں ۔" وہ یہ فرما رہے تھے اور میں ان کا منہ دیکھ رہا تھا حیران تھا کہ یہ میں کیا سن رہا ہوں اور طبقۂ امرا کی وہ کونسی درسگاہ ہے جہاں ایسے پاکیزہ و بلند خیالات ان میں پیدا کئے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف فطری صلاحیت سے ہوا کرتا ہے اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ قدرت نے ان پاکیزہ ہدایا کے ودیعت کرنے میں موجودہ فرمانروائے جاورہ کے ساتھ غیر معمولی فیاضی سے کام لیا۔

ہز ہائنس کی وسعت اخلاق کا یہ عالم ہے کہ ملازمین و رعایا میں سے کسی کی دعوت کو رد نہیں فرماتے اور اُن کے رنج و مسرت میں ایک شفیق باپ کی طرح ہر وقت شرکت کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی طرف سے گزر رہے ہوں اور دس پانچ افراد اپنا درد و غم سنانے کے لئے وہاں موجود نہ ہوں۔ پھر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے دادرسی چاہی ہو اور آپ نے موٹر روک کر اس کی عرضداشت نہ لی ہو اور ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جب آپ کسی معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو فیصلہ وہی ہوتا ہے جو عین مقتضائے انصاف ہے۔

ہز ہائنس کو تعلیم کی طرف خاص توجہ ہے، چنانچہ آپ نے ایک عام فرمان جاری کر دیا ہے کہ ریاست کے اندر جہاں کہیں طلبہ کی کافی تعداد فراہم ہو سکتی ہے وہاں مدرسہ قایم کر دیا جائے اور اگر رعایا میں سے کوئی جماعت خود کوئی تعلیم گاہ قایم کرنا چاہتی ہے تو دربار سے اس کی اعانت کیجائے ۔۔۔ تعلیم کے ساتھ ہی ہز ہائنس کو تجارت و صنعت کی ترقی کا بھی بڑا خیال ہے، چنانچہ خود جاورہ کے اندر لاکھوں روپیہ کے سرمایہ سے ایک کارخانہ شکر سازی[1] کا قایم کیا گیا ہے اور اس طرح سیکڑوں غربا کے لئے کسب معاش کا ذریعہ فراہم ہو گیا ہے۔ الغرض ہز ہائنس کا وجود جاورہ و اہل جاورہ کے لئے ایسی غیر معمولی سعادت و برکت کا سبب ہے کہ وہ اس پر جتنا فخر بھی کریں کم ہیں ۔۔۔ افسوس ہے کہ ولی عہد بہادر جیسے قدر نوا برادہ ناصر علی خاں اسوقت جاورہ سے باہر تشریف فرما ہیں اور اس لئے ان سے تبادلۂ خیال کا موقعہ نہیں ملا۔ تاہم مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ وہ بالکل اپنے والد محترم کے قدم بقدم چل رہے ہیں اور نہایت نیک نفس و پاکیزہ اخلاق رکھنے والے نوجوان ہیں۔ خدا اُن کی عمر میں برکت دے اور اپنے مخلص اقبال باپ کے سایۂ عاطفت میں انھیں اپنے اخلاق سنوارنے کی توفیق عطا ہو۔

میرے سفر جاورہ کا ذکر غالباً تا تمام رہے گا اگر میں اُس ہستی کو نظر انداز کر دوں جس نے اہل جاورہ کی ذہنیت بدلنے میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ ان کا اسم گرامی مولانا یحییٰ عین اللہ ہے اور اہل علم کے طبقہ میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو ان سے واقف نہ ہو۔ آپ صوبۂ بہار کے ایک نہایت معزز خاندان کے فرد ہیں اور آپ کی ساری عمر قوم کی دردناک حالت پر روتے ہوئے گزر گئی ہے ۔۔۔ آپ کی عمر اسوقت ۶۰ سال سے متجاوز ہے اور تیس سال اُس طرف آپ اُس آزاد خیالی کی بنیاد ڈال چکے تھے جس کا اب ہر اہل نظر دیوانہ نظر آتا ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ آپ نے خدائی کا دعوے کیا، نبوت کا ادعا فرمایا، مہدی ہونے کا اعلان کیا اور اس بنا پر آپ کے ساتھ بہت بیدردانہ سلوک کئے گئے، لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اُس کیفیت کو نہیں سمجھا جو مولانا پر طاری ہے اور انھوں نے اُن کی تصانیف و دعاوی کی اصل روح تک پہونچنے کی کوشش نہیں کی۔ وللہ در ما قال:-

شعلہ آہنگ خون منصوریم ساز ما سوخت از ترانۂ ما

مولانا نے میرے دوران قیام میں جس شفقت و محبت کا سلوک مجھ سے کیا ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

---

[1] افسوس ہے کہ ہندوستان میں شکر سازی کا مستقبل بہت تاریک ہے اور اس میں اسوقت تک کامیابی کی توقع نہیں کیجا سکتی جب تک جاوا میں برطانوی سرمایہ دار اس تجارت کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں۔

س ش ص

(مسلسل)

باب سوم در بیان ص

حضرت غالب کے مطبوعہ خطوط میں چودھری عبدالغفور کے نام جو خطوط ہیں روئے سخن اُن کا در اصل حضرت صاحب عالم صاحب بلگرامی سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی طرف ہے چنانچہ ایک خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں :-

" تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نساب، جامع مدارج جمع الجمع، بزم وحدت کی فروزندہ شمع، مستغرق مشاہدۂ شاہدِ ذات، حضرت عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے ....."

ایک دوسرے خط میں فرماتے ہیں :-

" جناب چودھری صاحب ! آؤ - ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں - اور اپنی آنکھیں اُن کے کفِ پائے مبارک سے ملیں - میں سلام کروں گا - تم معرف ہونا کہ غالب یہی ہے ! اہلِ دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے ! میں نے عزم قدمبوسی کیا - پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا -

فرماتے ہیں - غالب ! تو اچھا ہے ؟ - عرض کرتا ہوں کہ الحمدللہ ! حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے ؟ ارشاد ہوا کہ مولوی سید برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں -

جناب ! یہ ان کی خوبیاں ہیں - میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں - کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے ضعف قوی و اضمحلال کہتے تاکہ میں اُن کے کلام کی تصدیق کرتا - اُن کی غمخواری اور دردمندی کا دم بھرتا ؎

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن اینکہ من نمی میرم - ہم زناتوانی ہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا - بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا - مجھ میں اتنی طاقتِ پرواز کہاں کہ بلا سے آکر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اُٹھاؤں - حضرت ! سچ تو یوں ہے کہ غمہائے

روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ناُمیدی اُس کی دیکھا چاہئے"

یہ خط دہلی سے مارہرہ گیا تھا۔ مگر اس کو تعلق آرہ سے ہے۔ آرہ میں حضرت صاحب عالم کے نواسہ اور حضرت غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نے بوستانِ خیال کی اٹھارہ جلدوں کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا اور دو جلدیں شایع ہوئیں تو غالب نے مبارکباد دی :۔

نورِ نظر۔ لختِ جگر۔ زبدۂ اولادِ پیغمبر۔ مولوی سید فرزند احمد زاد مجدہ۔ اس درویش گوشہ نشیں کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستان خیال کے ترجمہ کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک۔ حضرت! یہ آپ کا احسان عظیم ہے۔ مجھ پر خصوصًا۔ اور بالغ نظرانِ ہند پر عمومًا۔

غالب ۱۲ ذیقعد ۱۲۸۱ھ

اسی بوستانِ خیال اُردو کی اور جلدیں صفیر بلگرامی کے نانا حضرت صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ نے غالب کو دیکھنے کے لئے بھیجیں تو چودھری عبدالغفور کے خط میں وہ جواب آیا جو اوپر لکھا گیا۔

صفیر بلگرامی کے بارے میں جوہر شناس کیا کہتے تھے اور کیا کہتے ہیں اس کا بیان قصیدۂ زلفِ لیلیٰ ہے۔ اس قصیدہ کا چہرہ یہ ہے :۔

مفتی سید محمد عباس شوستری :۔ جہان[1] است آلنگ خوش شہریور انوشہ بخوشہ فروزندہ ہور

بھادوں کی جھڑی ہے۔ ہریالی ہے۔ جبھی تو سورج مہاراج تک ایک کنیا کے پھیرے میں آ گئے!

بپیشم شتاباں بیا مو بدا بخشنی چہ خوانی برائے خدا

اے اگنی دیوتا کی آنکھوں کے تارے! تیری پوجھی جائے چولھے بھاڑ میں۔ ہمارے پاس آتا کیوں نہیں؟

---

[1] آلنگ = سبزہ زار ــــ شہریور = بھادوں کا مہینہ ــــ انوشہ = شاداں و خنداں ــــ خوشہ = گیہوں کے کھیت میں ایک کنواری لڑکی ہے، داہنا ہاتھ کندھے تک۔ ہاتھ میں مٹھی بھر گیہوں کی بالیاں۔ البیلی ایسی کہ پاؤں رکھتی کہیں ہے اور پڑتا کہیں ہے۔ سر پچھم اور پاؤں پورب دکھن!

اہلِ نجوم نے آسمان کو بارہ حصوں (بروج) میں تقسیم کیا ہے۔ ان بارہ برجوں میں چھٹے برج کا نام ایران میں سنبلہ رکھا گیا سنبلہ یعنی خوشۂ گندم۔ ہندوستان میں کنیا رکھا گیا۔ کنیا کنواری لڑکی ــ اس مصرع میں خوشہ سے مراد سنبلہ یعنی کنیا ہے اس لئے انوشہ بخوشہ فروزندہ ہور کا مطلب یہ ہوا کہ آفتاب برج سنبلہ میں ہے۔ یعنی سورج مہاراج ایک کنیا کے پھیرے میں آ گئے۔

ہور ــــــــــ آفتاب

موبد ــــــــــ جس طرح ہندوؤں میں پنڈت اُسی طرح پارسیوں میں موبد

یَشنی ــــــــــ پارسیوں کی کتاب وظائف

چہ از برسرائی نسک[1] ہائے ژند ببین و بخواں نامۂ دل پسند

ہم پوچھتے ہیں کہ وہاں بیٹھا ہوا کیا الاپ رہا ہے؟ تیری پوتھی میں آخر رکھا کیا ہے؟ دیکھنا ہو تو ادھر آ۔ پڑھنا ہو تو ادھر آ۔

کہ فرزند احمد ہمایوں نشش گرامی نژاد و خجستہ روش

فرزند احمد کو دیکھ۔ جس کا سبھاؤ اچھا۔ جس کی پیڑھی اونچی۔ جس کی چال ڈھال اچھی۔

نشست است زیبا تر از گلستاں مگر۔ تا دلت شاد گردد از آں

پھلواڑی میں وہ پھول کہاں جو اس کے پاس ہیں؟ آ کر دیکھ لے۔ جھولی بھر لے۔

کہ فرزند احمد دبیر کبیر جوان است و خوش فکر و بلبل صفیر

فرزند احمد قلم کا دھنی ہے۔ بگت گرو ہے۔ جوان ہے ..... بلبل ہے۔ صفیر ہے!

میرزا دبیر لکھنوی (۱) "خطیب منابر فصاحت و نکتہ دانی۔ عندلیب حدائقِ بلاغت و رنگین بیانی سلمک اللہ تعالیٰ"

(۲) "نک خوانِ سخن، محک امتحانِ طرزِ ممتحن، فصاحت سرمایہ، بلاغت پیرایہ، سید فرزند احمد صاحب۔ متخلص بہ صفیر زاد قدرہ۔ بادۂ تمنا در جام و زلالِ مدعا ہموارہ بکام باد!"

مرزا محمد باقر صحبت شیرازی از قصیدہ در مدح حضرت صفیر بلگرامی

ہزار مرتبہ گر مدح حضرت تو سرایم یک از ہزار نگویم چہ منجلی و چہ مبہم

ہم آسمان جلالی۔ ہم آفتاب جمالی ہم آستانِ کمالی۔ جلیل قدر و معظم

جناب سید فرزند احمدی و صفیری ہمی ز زمرۂ سادات بلگرام مفخم

گرم بلطف بخوانی۔ ورم بقہر برانی سر اندرم بکمند تو است۔ و حکم تو محکم

بپائے حمت و فضل ار قدم کنی سوئے صحبت رسد بزخم درونش ز خاک پائے تو مرہم

مرزا حاتم علی مہر لکھنوی :۔ نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

الحمد للہ علی احسانہ کہ از صریر خامہ صفیرے بگوش خورد۔ و دلم از دست بردے

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست کہ ایں مژدہ آسائش جان ماست

مکرمت نامہ دی کہ یکم اگست بود با یک جلد علی بند و حسین بند برائے بندہ، و دو تا برائے برادر عزیزم میرزا عنایت علی مآہ سلمہ اللہ، و نور چشم آغا سخاوت علی ضیا اسسٹنٹ کلکٹر و ڈپوٹی مجسٹریٹ ایں ضلع ایٹہ اعلی اللہ درجاتہم معہ یک جلد سفر صفیر و یک جلد تذکرہ تلامذہ بلند فکر خیر الذکر بسبیل ڈاک رسید۔ و ایں خمسہ چوں خمسۂ نظامی بر حواسِ خمسہ ام نظام

---

[1] نسک سورہ ژند صحیفۂ زردشت

تازہ بخشیدہ ماشاء اللہ ہر تصنیف شریف لطفے دارد کہ دل شیدائے سخن می خارد ؎

بمانا و آں دوست کو دوستاں را غذائے دل و راحتِ جاں فرستد

مہجور، از عالی دودمان و والاشان اعزا اعزا امیر بادشاہ علی صاحب بقا میرزا سلامت علی صاحب دبیر مغفور خلف الصدق جناب میر وزیر صاحب مبرور، محامد و مدیح جناب بیشتر از بیشتر می شنفت۔ اکنوں از کلام بلاغت نظام بہ ازاں دریافتم کہ عزیزم میگفت۔ تعالیٰ شانہ سلامت داشتہ باشد۔ بحق محمد و آل محمد۔ میخواہم کہ گاہ گاہ بخاطر مبارک رسیدہ باشم

زرد چہر۔ قہر عفی عنہ

حضرت امیر مینائی :۔ بلبلِ شیراز و طوطی ہند کے ہمصفیر سلامت۔ سلام مسنون اخلاص و سپاس مشحون۔ سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماروں کی پرستاریوں نے مجھ سے جی بھر کے اُن آسائشوں کا عوض لیا جو میں نے ملاقات احباب سے سفر میں پائی تھیں۔ وہ سرگزشت لکھوں تو خط مرثیہ ہو جائے۔ کتنے ہی عزیز چل بسے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

اس اجمالی اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے فقیر، نام کے امیر، کو یہ نہ سمجھیں کہ وطن پہونچکر آپ کی مہربانیوں اور قدر دانیوں کی لذت بھول گیا۔ نہیں نہیں۔ سب اُسے یاد ہے۔

امیر اللغات کے اُصول سے متعلق ایک کاپی بھیج کر آپ کے دل و دماغ سے جواب باصواب کی آرزو ہے۔ زیادہ حاجت تصدیع نہیں۔

امیر احمد عفی عنہ

اجی حضرت! جلوۂ خضر کی دوسری جلد چھپنے میں کیا دیر ہے؟ ضرور لکھئے کہ کب تک مشتاقوں کو تڑپائیے گا۔ فقط والسلام بالاکرام۔ ۹ر دسمبر ۱۸۸۸ء۔

اس خط میں جس سفر کا حوالہ ہے اُس سے مراد عظیم آباد ہے۔ ۱۳۰۵ھ میں حضرت امیر مینائی اپنے شاگرد مہدی حسن خاں شاد آب رئیس رسول پور ضلع مظفر پور کے طلبیدہ عظیم آباد تشریف لائے۔ اور ریاض و کوثر کے ساتھ لال کوٹھی میں ٹھہرے۔

اُردو کا سب سے پہلا لغت سید اوحدالدین بلگرامی نے، اور اُسی زمانہ میں میر علی اوسط رشک لکھنوی نے، لکھا رشک کا لغت غیر مطبوع رہا۔ اس کے تقریباً ۳۶ برس کے بعد حضرت امیر مینائی کا یہ خط صفیر بلگرامی کو آیا۔ آرہ سے اس کا جواب ۲۲ر دسمبر کو چالیس صفحوں میں گیا۔ خط کیا ہے کہ دریائے تحقیق موجیں مار رہا ہے۔ صفیر بلگرامی کا جواب پانے کے چار سال بعد حضرت امیر مینائی نے امیر اللغات کا پہلا حصہ شائع کیا۔ جلوۂ خضر جس کے بارے میں امیر مینائی لکھتے ہیں کہ مشتاقوں کو کب تک تڑپائیے گا۔ صفیر بلگرامی کی وہ بلند پایہ تالیف ہے جس پر صوبۂ بہار ناز کر سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بیلی۔ پروفیسر لندن یونیورسٹی۔ اپنی کتاب ہسٹری آف اُردو لٹریچر (تاریخ ادب اُردو) مطبوعہ ۱۹۳۲ء صـ۹۲ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

صفیر بلگرامی۔۔۔۔ زندگی کا زیادہ حصہ ان کا آرہ میں گزرا۔ نظم میں ان کا کلام بہت کچھ ہے۔ بالخصوص غزلیات

ان کی مطبوعہ کتابوں میں صلوات خضر بیاضِ اشعار اور صفیر بلبل و خمخانۂ صفیر دو دیوان غزلیات بھی ہیں۔ ایک ناول روح افزا بھی لکھا تھا جو طبع نہیں ہوا۔ مگر ان کی اہم ترین تالیف جلوۂ خضر ہے۔ یہ تاریخ ہے ادب اُردو کی اور مولف کے خیال میں آزاد کی آبِ حیات میں جو غلط بیانیاں تھیں انھیں کی تصحیح کے لئے یہ کتاب لکھی گئی۔

شوق نیموی :- (۱) جناب فیض مآب سخنور نامی گرامی حضرت سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی مدفیضکم۔ محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی شاگرد حضرت تسلیم لکھنوی بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ جلال لکھنوی نے ایک رسالہ کارآمد شعرا تانیث و تذکیر میں لکھا ہے ..... ایک روز فخراً کہنے لگے کہ اس رسالہ کا موجد میں ہوں۔ اُس پر حضرت اُستاد نے فرمایا کہ سبحان اللہ صفیر بلگرامی اس قسم کا رسالہ پہلے لکھ چکے ہیں ..... تب جلال کچھ طعن کی باتیں کہنے لگے۔ ..... چند روز ہوئے کہ میں حضرت اُستاد کی خدمت میں رامپور گیا تھا۔ اس کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ عرصہ ہوا کہ اصل رسالہ چھپ گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر وہ مل سکے، تو ایک جلد بھیجدینا کہ جلال کو دکھاؤں۔ اس سبب سے التماس ہے کہ اب آپ کے پاس کوئی نسخہ رشحات کا موجود ہے یا نہیں ....."

(۲) سخنور نامی گرامی۔ چاشنی بخش مایدۂ شیریں کلامی۔ جناب سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی مدظلکم السلام خاکپائے ارباب ذوق محمد ظہیر احسن شوق بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ آپ کا نامہ نامی ورود ہوا..... آپ نے در باب رشحات جو کچھ تحریر فرمایا ہے سب بجا درست ہے۔ میرے ایک عم زاد برادر کے پاس وہ رسالہ ہے میں نے اس کی خوب سیر کی ہے۔ فی الحقیقت آپ اس کے موجد ہیں۔ رشحات اور کارآمد شعرا میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جلال کا دعوے محض بے بنیاد ہے۔ حضرت تسلیم کے پاس تسہیل تانیث و تذکیر تھی۔ میں نے عند التذکرہ اُن سے کہا کہ جس طرح اس میں متقدمین و متاخرین کے اختلاف بیان کئے گئے ہیں اُسی طرح اصل میں بھی ہر اک کی مثالیں بھی اس قسم کی موجود ہیں کہ جن کی بنا قوافی و ردیف پر ہے۔ اُس میں اغلاط کاتب کے گمان کو بھی گنجایش نہیں، اور کارآمد شعرا میں اس کا التزام نہیں ہے۔ یہ سنکر جناب ممدوح نے آپ کی جانفشانی کی کمال داد دی اور بہت مداح رہے ..... ہر چند آپ ایسے لائق لوگ کی خدمت میں اپنا کلام بے نظام مورد کلام بھیجنا سراسر گستاخی ہے ..... گرد و غزلیں جو فی الحال کہی ہیں ارسال کرتا ہوں..... اگر خدا نے چاہا تو اکے مرتبہ جب وطن کو جاؤں گا تو آرہ ہوتا جاؤں گا۔ ملاقات کی کمال آرزو ہے ....."

از شہر لکھنؤ۔ کشمیری محلہ۔ متصل چاہ حیدر بیگ خاں

رشحات صفیر تانیث و تذکیر کی تحقیق میں صفیر بلگرامی کی ایک دوسری بلند پایہ تالیف ہے۔ اس پایہ کی کتاب اب تک ہندوستان میں نہیں لکھی گئی۔ حضرت جلال لکھنوی کو دعویٰ تھا کہ وہ اس کے موجد ہیں۔ حضرت تسلیم لکھنوی اور شوق نیموی نے صفیر بلگرامی کی کتاب اسی دعویٰ کو رد کرنے کے لئے منگائی تھی۔

رشحات صفیر کے بارے میں حضرت غالب کا فیصلہ ملاحظہ ہو:۔

حضرت غالب :۔ سیدی سندی، نور بصر، لخت جگر، قرۃ العین اسد۔ مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبدء فیاض سے اس رسالہ کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے ... سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں ..... قوت علم اور حسنِ فہم اور لطفِ طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہونچائے ہیں جو مجھے دل سے پسند آئے ہیں۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظور انظار اولوالابصار رہے گا ..... مولف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر آرہ۔ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں۔ سید واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی، اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ ان حضرت کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمہ کا بیان ہے ؎

مادح خورشید مدّاحِ خود است کہ مراد و چشم سرنامہ مراد است

داد کا طالب، غالب

ایک اور خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں:۔

بعلاقۂ مہر و محبت نور چشم و سرور دل۔ اور برعایت سیادت مخدوم و مطاع۔ مولوی سید فرزند احمد.....

اشعار گہربار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ سب اچھے ہیں۔ مگر جو میرے دل میں اُتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں ؎

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

ورق ہیں جوششِ مضمونِ گریہ سے بادل بشانِ ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

کبھی ہوں گرم۔ کبھی سرد حسب موقع وقت صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ اور موحدانہ مضمون۔ اور بالغانہ الفاظ ؎

تم سلامت رہو قیامت تک صحت و لطفِ طبع روز افزوں

نجات کا طالب غالب۔ شنبہ ۲۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ

نواب سید رضا علی خاں عظیم آبادی نبیرۂ جعفر حسن خاں فیض شاگرد مصحفی علیہ الرحمہ:۔

خوشا اے رضا ایں کلامے کہ از وے بدل ہست قوت و بجاں ہست قوت

بود از تصانیف سحبانِ دوراں بلیغ الکلام و کلام البلاغت

گرامی دل و بلگرامی توطن صفیر سخن سنج عالی طبیعت

برین خانِ یغما چہ یاراں چہ اعدا بیایند و گیرند صد گونہ لذت،

جناب رازعظیم آبادی — سید عزیزالدین احمد بلخی رازعظیم آبادی مولف تاریخ شعرائے بہار لکھتے ہیں :۔
ادبِ اُردو کی تاریخ میں صفیر بلگرامی بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظم میں غالباً آٹھ دیوان کے قریب ان کے کلام مرتب ہوگئے تھے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

مشق تیری یہ بیالیس برس کی ہے صفیر آٹھواں فضلِ الٰہی سے ہے دیواں تیرا!

نثر میں تالیف و تصنیف کی تعداد نظم سے بھی زیادہ ہے۔ فہرست تصانیف حسب ذیل ہے :۔
جناب رازعظیم آبادی کی فہرست نامکمل ہے کیونکہ اس میں صرف بیس کتابوں کا حوالہ ہے۔ حالانکہ سنہ ۱۲۹۴ھ تک نظم میں ۷، ۵ اور نثر میں ۱۴، ۱۲ کتابیں تصنیف و تالیف ہوچکی تھیں۔ اور ان ایک سو چوبیس کتابوں میں تین کتابیں مجموعۂ فیض صفیر گلبنِ موزوں۔ اور بوستانِ خیال اردو بہتر جلدوں میں تھیں۔

نواب خیال عظیم آبادی ۔ مکتوب نواب نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی بنام سید وصی احمد بلگرامی۔
پرنسپ اسٹریٹ کلکتہ ۔ ۲۴ر جولائی سنہ ۱۹۱۵ء

عزیز محترم ۔ میں مرثیہ گویانِ ہند کا ایک تذکرہ مرتب کرنے کی فکر و کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ جناب غفرانمآب مولوی سید فرزند احمد صاحب مغفور نے بھی مرثئے کہے تھے اس لحاظ سے اُن مرحوم کا ذکر خیر بھی اس تذکرے میں ضرور واجب ہے۔ میں نے کوشش کی مگر اُن جناب کا کوئی مرثیہ مجھے اب تک نہیں مل سکا۔ آپ کا پتہ بھی معلوم نہ تھا جو قبل آپ کو لکھ سکتا۔ کسی طرح آپ کا نشان حاصل کرکے آج اس طرف متوجہ کرسکا ہوں۔ فرمایش ہے کہ اس کام میں خاطر خواہ میری مدد کیجئے اور آپ کے ذریعہ سے اگر پرانے مراثی کہیں مل سکیں تو اُن کے حاصل کرنے کی فکر کیجئے اور اپنے دادا صاحب (صفیر بلگرامی) مرحوم کے مراثی میں سے دو ایک بھی مل سکیں تو مجھے فوراً بھیجئے.....
جو تعلقات اُن مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُس کا اقتضا یہ ہے کہ میرے قلم سے اُن کے صحیح و ضروری حالات نکلیں۔ واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہجائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو۔ اور مجھے تو ایسا قلق ہوگا کہ اپنی باقی کل محنت کو رائگاں سمجھوں گا ..... مرحوم نے ایک تذکرہ بھی تالیف کیا تھا جس کا نام ہے جلوۂ خضر۔ مجھے اس کی بیحد ضرورت ہے۔ کسی طرح اس کو بھی فراہم کرکے مجھے بھیجئے۔ ایک فرنچ گارسن دی تاسی تذکرہ نویس خبر دیتا ہے کہ مرحوم نے سنہ ۱۸۶۸ء میں گلبن منظوم اور خلاصۂ فیض صفیر دو تالیفیں پٹنہ سے شائع کیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی کسی طرح مل جاتیں تو معلومات میں اضافہ ہوسکتا.....“

اس خط میں ایک جملہ غور طلب ہے :۔ جو تعلقات اُن مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُس کا اقتضا یہ ہے۔ واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو۔
یہ تعلقات کیا تھے ؟ — جواب یہ ہے کہ نواب خیال کے حقیقی چچا میر جعفر حسین فرہاد، اور حقیقی ماموں سید

علی محمد شاد و سید امیر حسن ایجاد کو صفیر بلگرامی کی شاگردی کا (ایک زمانہ میں) فخر حاصل تھا۔

یہاں تک تو دوسروں کا بیان ہوا۔ اب خود صفیر بلگرامی کا بیان اپنے بارے میں یہ ہے:۔

"ہیچمدان۔ ہیچمیرز۔ مقلدِ گزشتگان۔ معتقدِ فصحائے زمان۔ حد غرور سے منزلوں دور۔ شاگردِ خاندانِ ناسخ مغفور فیضیاب خدمت شیخ امان علی سحر و برق و تجر۔ کوچہ گردِ شہر شہر۔ زلہ ربائے خوانِ فیض غالب و دبیر روشناس برنا و پیر شعرا کا دوست غمخوار یار۔ باوجود ہیچمدانی مشہور دیار و امصار۔ کشتۂ تیغِ ستم تلامذہ۔ موردِ مراحم اساتذہ۔ بندہ حقیر سید فرزند احمد صفیر بلگرامی مقیم قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد"

اس بیان میں مرثیہ کا ایک ٹکڑا بھی ہے یعنی "کشتۂ تیغ ستم تلامذہ!" شاگرد اپنے اُستاد کو ستم کی تیغ سے کیوں ذبح کرتا ہے اُس کو پوچھنا چاہئے افضل الدین خاقانی سے جس نے ابوالعلا سے بغاوت کی۔ اور شریف سے جس نے لسانی سے بغاوت کی اور بساطی سے جس نے کمال خجندی سے بغاوت کی۔ اور مومن دہلوی سے جس نے شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی اور سکندر شاہجہاں پوری سے جس نے مومن دہلوی سے بغاوت کی۔

(۱) خاقانی کو ابوالعلا نے لکھایا پڑھایا۔ بتایا سکھایا جب کسی قابل ہوا تو اُس کو ہاتھ پکڑ کے خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں لے گیا۔ اور خاقان کی رعایت سے خاقانی تخلص بخشا۔ ان احسانوں کا صلہ خاقانی نے یہ دیا کہ ابوالعلا کی ہجو کہی اور کہا کہ تو ہوتا کون ہے جو ہمارا اُستاد بنے؟ ؎ مرا دل پیرِ تعلیم است و من طفلِ زبان دانش!

پھر کہا کہ ؎ از لکدِ حادثاتِ سخت شکستہ دلم — بست خیالم کہ ہست ایں خلل از ابوالعلا

آخر ابوالعلا کو کہنا پڑا ؎

خاقانیا! اگرچہ سخن نیک دانیا — یک نکتہ گویمت۔ بشنو رایگانیا

ہجو کسے کمن کہ ز تو مہ بود بہ سن — شاید ترا پدر بود و تو ندانیا

(۲) اسی طرح شریف نے اپنے اُستاد لسانی سے بغاوت کی تو اُس کے دیوان پر اعتراض کئے اور سہو اللسان نام کتاب لکھی۔ ان اعتراضوں کا جواب حیدری شاگرد لسانی نے لسان الغیب میں دیا۔

(۳) اسی طرح بساطی شاگرد کمال خجندی نے شوخ چشمی کی ؎

غزلہائے بساطی را کمال از خود مداں کمتر — کہ پرورد است چوں خواجہ بآب دیدہ سلمانش

کمال خجندی نے جواب دیا ؎

اے خواجہ تو مرد خود فروشی — رخت تو دریں دکاں نگنجد

(۴) اسی طرح حکیم مومن خاں دہلوی نے اپنے اُستاد شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی تو شاہ نصیر نے کہا ؎

کمان و تیر نمط ربط تھا مجھے اُس سے — جب اُس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا

(۵) اسی طرح سکندر خاں سکندر شاہجہانپوری نے اپنے اُستاد مومن خاں سے بغاوت کی۔ قصہ یہ تھا کہ سکندر اپنی غزل اصلاح کے لئے لایا۔ اُس غزل میں ایک شعر تھا ؎

دم لینے میں ہے مجھ کو تو آئینہ کا لحاظ اور یار یہ سمجھتے ہیں۔ مجھ میں ہے دم نہیں

مومن نے کہا یہ شعر بے معنی ہے۔ قابل اصلاح نہیں۔ سکندر نے کہا کہ آئینہ میلا ہو جانے کا خوف تھا۔ اس لحاظ سے ہم نے دم سادھ لیا۔ دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اس میں دم ہی نہیں۔ مومن نے کہا کہ آئینہ کا لایا جانا خود بتا رہا ہے کہ اسوقت عالم کیا ہے۔ پھر دم سادھنا کیسا؟ سکندر کو آئینہ پر ناز تھا۔ حجت کرنے لگا۔ بات بڑھی۔ آخر سکندر نے مومن سے کہا کہ آپ کو اُستاد کس نے بنایا؟ اصلاح کو پوچھئے تو بات اتنی ہے کہ ہم آپ کا کلام دیکھتے تھے۔ آپ ہمارا کلام دیکھتے تھے۔ اس میں اُستادی اور شاگردی کیسی؟

علامہ تفتازانی اپنے شاگردوں سے اس قدر نالاں تھے کہ پاؤں میں ایک مرتبہ کانٹا گڑ گیا تو علامہ نے آبدیدہ ہو کر پوچھا ــــ "اے کانٹے! سچ سچ بتا۔ کیا تو نے بھی ہم سے کچھ سیکھا تھا؟" پھر حضرت صفیر بلگرامی نے اپنے کو کشتۂ تیغ ستم تلامذہ کہا تو کون سی انوکھی بات کہی؟ بقول مولف آبحیات :۔

"شعرا میں اپنے سے خود پسندی اور دوسرے کے لئے ناتواں بینی ایک ایسی عادت ہے کہ اگر اسے قدرتی عیب کہیں تو کچھ مبالغہ نہیں۔ بلکہ شاگردوں کو اُستادوں سے دست و گریباں ہوتے دیکھا تو اکثر اسی فن (شاعری) میں

اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

سنہ ۱۲۵۵ھ۔ جناب شاد الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی پٹنہ سے مرشد آباد گئے۔ قیام تین سال۔

سنہ ۱۲۵۸ھ۔ جناب فریاد مرشد آباد سے کلکتہ گئے۔ قیام بیس سال۔

سنہ ۱۲۶۲ھ۔ ولادت میر علی محمد شاد عظیم آبادی۔ اسی سال صفیر بلگرامی نے شاعری شروع کی۔

سنہ ۱۲۷۶ھ۔ حضرت فریاد صرف چار ماہ کے لئے کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ پھر کلکتہ واپس گئے۔ قیام تین سال۔

حیاتِ فریاد صفحہ ۱۱۶-۱۱۷ میں جناب شاد فرماتے ہیں :۔

اڑتیس سال اپنی عمر گراں بہا کے حضرت (فریاد) نے مرشد آباد و کلکتہ میں بسر کئے۔ منجملہ جس کے پینتیس سال کلکتہ میں صرف ہوئے۔ اس طویل مدت میں حضرت تین دفعہ عظیم آباد آئے۔ تیسری دفعہ تو خیر دفعہ تھی۔ اور اس کے قبل دو دفعہ تشریف لائے۔ ایک دفعہ تو ۱۸۵۵ء میں غدر کے دو سال قبل جبکہ راقم کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ اور چار ماہ صرف عظیم آباد میں قیام فرمایا۔ راقم اس زمانہ میں شرح مسلم پڑھتا تھا۔ ایک روز ناظر وزیر علی عبرتی مرحوم کے ہاں سے مشاعرہ کی طرح ؎ "جب سے اُس ابرو نے پیدا تیغ عالمگیر کی"۔ آئی اسوقت تک راقم نے کبھی ایک شعر غزل کا نہیں کہا تھا ..... حضرت (فریاد) نے والد سے ارشاد فرمایا کہ طرح میں

چند شعر اس لڑکے کو کہنے دو..... (میں نے) گیارہ شعر کہہ کر حاضر کئے..... یہی بنیاد راقم کی شاعری اور حضرت (فریاد) کے زمرۂ تلامیذ میں داخل ہونے کی شرفیابی کی ہے۔"

تاریخ لکھنے میں جناب شاد سے سہو ہوا ہے۔ کیونکہ ۱۸۵۵ء میں اُن کی عمر دس سال کی تھی۔ نہ کہ چودہ پندرہ سال کی۔ اور شاعری انھوں نے نہ تو دس سال کی عمر میں شروع کی نہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں۔ جناب شاد کے دست وقلم کی تحریر مورخہ اپریل ۱۹۲۶ء ہمارے پاس موجود ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:۔ "سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شاعری و تصنیف کا شوق ہوا۔" اس تحریر کے آٹھ ماہ بعد شاعری کی شمع خموش ہوگئی۔ الغرض حضرت فریاد کلکتہ سے چار ماہ کے لئے جب پٹنہ آئے تھے اسوقت تک جناب شاد نے شاعری شروع نہیں کی تھی۔

۱۲۷۹ھ۔ حضرت فریاد دوسری دفعہ کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ اس سال جناب شاد نے شاعری شروع کی۔ اور اٹھارھویں برس پہلی غزل کہی۔

۱۲۸۰ھ صفیر بلگرامی کا پہلا دیوان ۱۲۷۳ھ میں مرتب ہوا تھا۔ سال ترتیب سے جمع شد سرمایۂ حیات صفیر۔ اسوقت جناب شاد کو بارھواں سال تھا۔ اس کے سات برس بعد ۱۲۸۰ھ میں دیوان صفیر بلبل پٹنہ سے شائع ہوا تو جناب شاد کو اُنیسواں سال تھا اور انھوں نے تاریخ طبع دیوان کہی۔

چو ایں دیوانِ رنگیں طبع گردید — پُر از معنی و الفاظ خوش اسلوب
بجستم سالِ طبعش شاد از طبع — شدہ شیریں سخن تاریخ مرغوب

۱۲۸۱ھ۔ حضرت فریاد عظیم آباد سے کلکتہ گئے۔ وہاں قیام گیارہ سال رہا۔

اسی سال جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر رئیس حاجی گنج کے ساتھ میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی کے مکان پر صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لئے حاضر ہوئے اور اُن کی درخواست قبول کی گئی

۱۲۸۱ھ سے ۱۲۸۷ھ مسلسل سات برس تک جناب شاد نے صفیر بلگرامی سے اصلاح لی۔

۱۲۸۷ھ صفیر بلگرامی عظیم آباد سے مظفر پور تشریف لے گئے۔ وہاں قیام تین سال رہا۔

۱۲۸۸ھ صفیر بلگرامی کو استادی راس نہیں آئی۔ جناب شاد نے شاگردی سے انحراف کیا اور اس انحراف کے بعد حضرت فریاد سے ملنے کے لئے کلکتہ گئے۔ کلکتہ میں صرف دو ماہ قیام رہا۔

۱۲۹۰ھ صفیر بلگرامی مظفر پور سے عظیم آباد واپس آئے۔ آئے تو کیا دیکھا؟ اسکا حال خود صفیر بلگرامی کے قلم سے سنئے:۔

"..... غرض ۱۲۸۷ھ ہجری تک جناب شاد کو مجھ سے برابر تلمذ رہا..... آخر میں طبیعت اُن کی منحرف ہوئی۔ اور میری شان میں کچھ فرمانے لگے۔ اگرچہ واقف کاروں کی روک ٹوک سے کبھی کبھی خاموشی بھی اختیار کرتے تھے۔ مگر ناواقفوں میں اپنی تعلی کی لیتے تھے۔ میں تین برس کے بعد مظفر پور سے آیا۔ جناب شاد کا رنگ ہی اور پایا۔ مگر میرے

سامنے کچھ نہیں کہتے تھے۔ میں نے بھی کچھ نہ چھیڑا۔ آخر کشمیری کوٹھی میں انھیں کی فرمایش سے مشاعرہ شروع ہوا۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ انھوں نے مشاعرہ کی غزل میرے ہوتے۔ بے اصلاحی پڑھی۔ خدا کے کارخانے! غیر طرح میں جناب بحر لکھنوی کے دو چار شعر پڑھ گئے۔ شعرا نے گرفت کی۔ اور یہ غلغلہ تمام پٹنہ میں پھیلا۔ اور دوسرے مشاعرہ میں اسی زمین میں ایک غزل کہہ کر لائے۔ اس پر بھی اعتراض ہوئے۔ مومن خاں کی رباعیاں۔ سحر کے قصیدے کے اشعار پکڑے گئے۔ آخر مشاعرہ کا آنا چھوڑ دیا۔

دو چار مشاعروں کے بعد ایک دن مشاعرہ کے وقت میرے پاس آئے۔ میں ہمراہ جناب نکہت کھانا کھاتا تھا مجھ سے فرمایا کہ آج صبح سے لوگ مجھے دق کرتے ہیں کہ تم نے صفیر سے اصلاح لینے سے انکار کیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ میں انکار کب کرتا ہوں۔ اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ مجھے انکار نہیں ہے۔ میں بیشک آپ کا شاگرد ہوں میں نے کہا۔ "میر علی محمد صاحب! میں بھی سنتا تھا۔ مگر جب آپ کہتے ہیں تو خیر میرا شک نکل گیا۔ بولے اگر فرمایئے تو میں اس مضمون کی رباعی کہہ کر مشاعرہ میں پڑھ دوں۔ میں نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے۔ غرض یہی باتیں کر کے چلے گئے۔ اس کی شہادت جناب نکہت نے اپنے دستخط میں دی ہے۔ اور میں نے بھی اس کی یاد جناب شاد کو نمیقہ محبت وثیقہ میں دلائی ہے غرض یہ کہ جناب شاد مشاعرے میں نہ گئے۔

اب انھوں نے مشاعرہ میں آنا چھوڑا۔ مگر میں اسی طرح اکثر ملاقات کو جایا کرتا۔ وہ اپنی غزلیں پڑھتے تھے۔ سن لیتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ بول بھی دیتا تھا طبیعت تیز تھی۔ اچھا کہنے لگے۔ ۱۲۹۱ھ میں انھوں نے مثنوی نالۂ شاد تصنیف فرمائی۔ اس پر شعرائے عظیم آباد نے اعتراض کئے۔ مگر جناب شاد کو مجھ پر گمان ہوا۔ ایک دن مجھے چھیڑ کر پوچھا۔ میں نے انکار کیا۔ اور کہا بھلا میر علی محمد صاحب! میں آپ پر اعتراض کروں گا؟ یہ البتہ کہتا ہوں کہ جناب شاد میرے شاگرد ہیں۔ یہ سنکر بولے اب میرا دل صاف ہوا۔ لوگوں نے مجھے ناحق بدظن کیا تھا۔ غرض پھر وہ باتیں رفع ہوئیں۔"

۱۲۹۱ھ "اور اب جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد بھی کلکتہ سے پٹنہ تشریف لائے۔ پھر جناب شاد کو وہی سوجھی۔ اور اب برملا کہتے پھرے۔ مشاعرہ میں تو خود نہیں آتے تھے مگر چند شاگرد درست کئے۔ اور میرے پڑھنے میں خلل ڈالنا شروع کیا۔ آخر میں آدمی ہوں۔ یہ ادا ناپسند ہوئی۔ البتہ اشعار مشتمل بر نصائح میں نے پڑھے اور محمد ہاشم (عزیز و شاگرد صفیر بلگرامی و مہتمم مطبع نور الانوار آرہ) سے کہا کہ ایک مجموعہ اسناد شاگردان کا درست کریں اور اسکا نام نشانِ فیض رکھا۔ اس میں جمیع شاگردوں کے اسنادِ دستخطی اور کلام اصلاحی موجود ہیں۔ اور واقف کاران شاگردیٔ جناب شاد کے سامنے پیش کیا کہ حقاً اور ایماناً جو کچھ جانتے ہوں لکھ دیں۔ چنانچہ بیک جلسہ چودہ حضرات نے دستخط بلا اکراہ بے تامل، بدوں میری لجاجت اور سماجت کے اپنے دست مبارک سے فرمائے۔ اور جو کچھ جانتے تھے تحریر کیا۔

یہ خبر جناب شاد کو پہونچی۔ اکثر اہلِ دستخط کے پاس جاکر فرمایا کہ آپ لوگوں کا ہم وطن ہوں۔ آپ نے دستخط کیوں کئے؟ انھوں نے فرمایا کہ ایمان کے باب میں کسی کا پاس نہیں کیا جاتا۔ جو ہم جانتے تھے لکھ دیا جب انھوں نے دیکھا کہ اب تو دستخط ہو گئے۔ پھر کشمیری کوٹھی میں آکر جناب نکہت کے سامنے میری شاگردی کا اقرار کیا جس کو جناب نکہت نے اپنے دستخط میں تحریر کیا ہے:-

۱۲۹۳ھ (۱) العبد سید حامد حسین نکہت۔ باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاد روبروئے من اصلاحے چند از میر صفیر صاحب گرفتہ ماند۔ انکار ازاں انحراف از ایمان است۔ واقرار زبانی، بعد انکار ہم، دو دفعہ در غریب خانہ کردہ اند۔ یکبار کہ ہمراہ شاہ حفاظت حسین صاحب وقت شب در مشاعرہ کشمیری کوٹھی تشریف آوردہ بودند۔ دیگر وقتیکہ میر فرزند احمد صاحب صفیر ایں اسناد اوستادی خود دریں شہر شایع کردند، خود نزد حقیر آمدہ گفتند کہ ایں چنیں اصلاح از ناظر عبرتی مرحوم نیز گرفتہ ام پس ازیں چہ حاصل کردم؟ مگر میدانم کہ اصلاح دادن صفیر سلمہ اللہ القدیر مثل اصلاح ناظر صاحب مرحوم نیست کہ از خطوط کہ نوشتۂ شان است ظاہر است۔ فقط بقلم خاص نکہت،

(۲) ہمارے علم میں میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر فرزند احمد صاحب کے ہیں۔ آغا مرزا عفی عنہ،

(۳) العبد علی مرزا عفی عنہ۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دوبار اصلاح لیتے دیکھا ہے۔ اور یہ بھی یقینی کہہ سکتے ہیں کہ اکثر با اصلاح لی ہے بقلم خاص اور بھی واضح ہو کہ چند رقعات اور غزلیں اور مرثیہ جو دستخط خاص جناب میر علی محمد صاحب شاد سے ہیں۔ ہم بقسم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اصلاح بھی جناب میر فرزند احمد صاحب صفیر کے ہاتھ کی ہے۔ فقط

اور یہ بھی یاد بہت اچھی طرح ہے کہ جسوقت یہ مرثیہ جو اس کتاب میں موجود ہے، جناب میر علی محمد صاحب، ہمراہ جناب میر فرزند احمد صاحب کے، واسطے اصلاح پاس مرزا دبیر صاحب مرحوم کے لے گئے تھے۔ ہم بھی حضور میں جناب مرزا دبیر صاحب کے حاضر تھے۔ فقط"

(۴) ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سید علی محمد صاحب شاد نے ہمارے مکان میں بروز مشاعرہ اکثر اصلاح لی ہے۔ اور ہمکو اُسوقت شوق غزل گوئی کا نہ تھا۔ فقط۔ محمد عسکری خاں عرف حسن نواب صاحب عفی عنہ،

اور جسوقت اس مرثیہ کو جناب میرزا دبیر صاحب کے حضور میں واسطے اصلاح کے سید علی محمد صاحب کو ساتھ میر فرزند احمد صاحب لے گئے تھے، ہم بھی موجود تھے۔ بلکہ میر بادشاہ علی صاحب بقا نے ہم سے پوچھا کہ یہ مرثیہ میر علی محمد صاحب نے کہا ہے یا میر فرزند احمد نے کہدیا ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ نہیں میر علی محمد صاحب نے کہا ہے۔ مگر شاید میر فرزند احمد صاحب نے دیکھا ہو تو عجب نہیں۔ فقط"

(۵) فی الحقیقت ہم واقف ہیں۔ اکثر غزل دکھاتے ہوئے بچشم خود دیکھا۔ بلکہ اصلاح اور غیر اصلاح اقبل اصلاح اکثر غزلیں میر علی محمد صاحب کی دیکھنے میں آئیں۔ اور اکثر رقعہ بنام میر فرزند احمد صاحب صفیر تحریر میر علی محمد صاحب دیکھے

اور ہم حزن بھی پہچانتے ہیں۔ چنانچہ مرثیہ کی تمام و کمال کیفیت سے ہم خوب واقف ہیں۔
بقلم خاص سید محمد حسن خاں عرف منجھلے صاحب فطنتی"

واضح ہو کہ نواب سید محمد حسن خاں فطنتی اور نواب سید محمد حسین خاں ہجرتی دونوں ناظر وزیر علی عبرتی کے شاگرد تھے۔ ہجرتی وہی ہیں جن کے ہاں امتحانِ موج کا معرکہ ہوا تھا۔ اور فطنتی وہ ہیں جن کے صاحبزادے نواب سید محمد رضا خاں عرف بنا صاحب موج عظیم آبادی جناب شاد کے شاگرد تھے۔

(۶) "ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے بھی دیکھا۔ اور خوب واقف ہیں۔ اور جلسہ مشاعرہ میں بھی غزل دکھاتے ہوئے میر علی محمد صاحب شاد کو میر فرزند احمد صفیر سے اپنی آنکھوں سے خاص مشاعرہ میں دیکھا ہے۔ اکثر سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب متخلص بہ ہجرتی۔

اور اُن کے رقعہ وغیرہ بھی لکھے اور مرثیہ وغیرہ بھی اصلاح دیا ہوا دیکھا ہے۔ بقلم خاص سید محمد حسین خاں رضوی عرف چھوٹے صاحب متخلص بہ ہجرتی۔

(۷) میر علی محمد صاحب اور ہم ایک ہی ہفتہ میں جناب استادی میر فرزند احمد صاحب قبلہ و کعبہ کے شاگرد ہوئے۔ اور اکثر ہم اور وہ ساتھ اصلاح لیا کئے۔ پانچ سات برس برابر یہی کیفیت رہی۔ سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان میرزا بقلم خاص

(۸) میں نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے حاجی گنج کے مشاعرہ میں دیکھا ہے۔ اور خطوط بھی اُن کے لکھے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ بقلم خاص سید علی اصغر عفی عنہ۔ عرف سید وزیر نواب صاحب عفی عنہ۔

واضح ہو کہ انھیں سید وزیر نواب کے صاحبزادے سید مرتضیٰ نواب مفتون عظیم آبادی جناب شاد کے شاگرد تھے۔

(۹) ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے دیکھا ہے۔ اور رقعہ بھی اُن کا دیکھا ہے اُس میں لفظ استادی لکھتے ہیں اور لفظ تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد بھی لکھتے ہیں سید مظفر حسین خاں عرف سید نصیر نواب عفی عنہ۔

(۱۰) ہم خوب جانتے ہیں کہ ابتدائے مشاعرات کشمیری کوٹھی ۱۲۸۱ھ تا مشاعرہ حاجی گنج بمکان میر علی محمد صاحب شاد کہ جس میں مولوی وحید صاحب الہ آبادی بھی شریک تھے۔ اُسوقت تک میر علی محمد صاحب میر فرزند احمد صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ اور شاگردی میر فرزند احمد صاحب کی اپنا فخر جانتے تھے۔ میر فرزند احمد صاحب مظفر پور تشریف لے گئے اور تین برس تک وہاں بذریعہ چھاپہ خانہ کتب کے وہیں تشریف فرما رہے اسی عرصہ میں میر علی محمد صاحب نے اُنکی شاگردی سے انکار کیا۔ العبد سید عبد الحکیم

واضح ہو کہ یہ وہی عبد الحکیم تکمین قنوجی ہیں جو معرکۂ شاد و احسن کے زمانہ میں سید محبوب شیر کے ہاں جاسوس بنا کر بھیجے گئے تھے۔

(۱۱) العبد یوسف حسین ماہر لکھنوی۔ خوب می دانم کہ جناب میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر صفیر صاحب ہستند چنانچہ

بیشتر است۔ بازنہ گفتم کہ اگر چنیں است بسم اللہ! مگر یاد دارند کہ اگر احیاناً بعد ازیں کسے از من فاضل تر از لکھنؤ یا دہلی بیاید از من نخواہند برگشت۔ جواب نقص و عیب کلام شما ذمہ من است۔ من جواب خواہم داد۔ آں صاحب اقرار کردند۔ و ہماں وقت بر غزل ملاّں ہے۔ وصاّل ہے کہ در شگوفۂ نکہت مندرج است اصلاح دادم۔

واز آں روز آمد رفت روزانہ بخانۂ آں صاحب واز پاسے از روز باقی و تا دہ ساعتِ شب، یا بیش و کم از ان نزد آں صاحب ماندن بر خود متحتم کردم۔ واز طرف آنصاحب روزانہ سواری برائے رفتن من تا کشمیری کوٹھی می یافتم.... بامن ایں سلوک مسلوک بود تا دو سہ سال برابر چوں بفضل خدا تعلیم یافتند، بندہ ہم آمد رفت ہر روزہ کم کرد۔ وبعد دو چار روز جاری نمود۔"

افسوس کہ والد ماجد و عم نامدار آں صاحب رخت بجناں کشیدند۔ خدا شما را در جوار خود جا دادہ باشد اگر می بودند ہرگز از شہادت انکار نمی کردند۔ وایں وقت ہم می دانم کہ جناب میر جعفر حسین صاحب وجناب میر امیر حسن صاحب وجناب شاہ حفاظت حسین صاحب و دیگر صاحبان حاجی گنج کہ در آں وقت بہ کاشانۂ آں صاحب با جناب محسن صاحب مرحوم صحبت گرم می داشتند زنہار در دریغ نخواہند گفت۔ چنانکہ صاحبانِ کشمیری کوٹھی و گزری وغیرہ از شہادت دادن و بدست خود نوشتن پہلو تہی نکردند۔...."

ہمالا ایں قصہ بطول انجامید۔ می خواہیم کہ فیصلۂ ما در آں صاحب بر ہمیں شود کہ قرآن پیش نہادہ رو برو بے عمائد انصاف کیش وجناب شاہ اُلفت حسین صاحب فرماید اور لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ ہماری ہی تخصیص کیوں ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ آپ سے بڑھ کر کسی کو نہیں سمجھتے۔ تب ہم نے کیا نہیں کہا تھا کہ اگر ایسا ہی تو بسم اللہ۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ لکھنؤ یا دہلی سے اگر کل کوئی شخص ہم سے فاضل تر آگیا تو آپ کو ہم سے انحراف نہیں کرنا ہوگا۔ باقی رہا آپ کے کلام کا نقص۔ تو یہ بوجھ ہماری گردن پر رہا۔ ہم اس کا جواب دے لیں گے۔ آپ نے یہ شرط قبول کی۔ اور تب ہم نے اُسی وقت آپ کی غزل پر اصلاح دی۔ یہ غزل ملاّں ہے۔ وصاّل ہے شگوفۂ نکہت میں موجود ہے.... اور اُس روز سے ہمارا معمول ہوا کہ روزانہ سہ پہر کو آپ کے گھر جایا کرتے اور تقریباً دس بجے شب تک ٹھہرا کرتے۔ اور پھر آپ ہی کی سواری پر کشمیری کوٹھی واپس آیا کرتے.... دو تین برس تک یہی معمول تھا جب خدا کے فضل سے آپ تعلیم پا گئے تو ہم نے بھی اپنا جانا کم کر دیا۔ اور اب دو چار روز پر جانے لگے۔ افسوس اسکا ہے کہ آپ کے والد ماجد اور عم نامدار جنت کو سدھارے۔ خدا اُن لوگوں کو اپنے جوار میں جگہ دے۔ آج وہ لوگ زندہ ہوتے تو ضرور ہماری تصدیق کرتے اور یقین ہے کہ میر جعفر حسین اور میر امیر حسن اور شاہ حفاظت حسین اور حاجی گنج کے اور لوگوں سے، جو آپ کے گھر میں محسن صاحب مرحوم سے ملنے آتے تھے، پوچھا جائے تو وہ لوگ ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے جس طرح صاحبان گزری و کشمیری کوٹھی نے اپنے دست و قلم سے تحریری شہادت دینے سے دریغ نہ فرمایا واضح ہو کہ سید امیر حسن ایجاد جناب شاد کے چھوٹے بھائی۔ اور میر جعفر حسین اُن کے چچیرے بھائی تھے۔ یہ قصہ بہت طول ہو گیا ہے۔ اب تصفیہ یوں ہی ہو سکتا ہے کہ قرآن سامنے رکھا جائے۔ اور خود جناب شاہ اُلفت حسین صاحب فریاد اور دیگر عمائدین معتبر کے سامنے آپ حلف لیں کہ یہ

آں خطوط را ملاحظہ فرمایند۔ وتصدیق گویند کہ از من نیست۔ من قبول بدارم وازاں وقت باز دعوی استادی نکنم۔"

حالا نامہ بر دعا ختم می کنم دانم دل می گویم کہ خداوندا حق را بر زبان جاری کن۔"

خطوط آپ کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر آپ نے قسم کھالی تو ہم خود آپ کو معاف کر دیں گے اور پھر کبھی یہ دعویٰ نہیں کریں گے کہ آپ ہمارے شاگرد ہیں، واضح ہو کہ ان خطوط سے مراد وہ خطوط ہیں جو شاگردی کے زمانہ میں جناب شاد نے صفیر بلگرامی کو بھیجے تھے۔ اور جن میں اُستادی اور تلمیذ حلقہ گوش علی محمد تحریر فرمایا تھا۔ اب اس خط کو ہم ختم کرتے ہیں اور دل سے دعا مانگتے ہیں کہ خدایا! تو شاد کی زبان پر حق جاری فرما۔

۱۲۹۶ھ جناب شاد نے اس خط کے جواب میں ایک اغلاط صفیر نام ایک رسالہ ترتیب دیا۔ اس رسالہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے میر انیس و مرزا دبیر کے کلام پر اعتراض کر کے انتخاب نقص نام ایک رسالہ شایع کیا تھا۔ نساخ کی اس جرأت پر اساتذہ برہم تھے اور ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس آگ سے جناب شاد نے فائدہ یہ اٹھایا کہ شعرائے لکھنؤ و کلکتہ و رامپور کو لکھ بھیجا کہ نساخ پر اعتراض کئے جائیں، تو آپ لوگ دستخط کریں گے؟ وہاں سے جواب آیا کہ ضرور۔ اندھا چاہے دو آنکھیں! جب یہ طے پا گیا تو جناب شاد نے عظیم آباد سے کھچڑی پکا کر بھیجی یعنی دس بیس شعر نساخ کے۔ باقی صفیر بلگرامی کے نتیجہ یہ ہوا کہ نساخ کے دھوکہ میں صفیر بلگرامی کی گردن ماری گئی۔ یہی مجموعہ اغلاط صفیر جناب شاد نے اپنے شاگرد سید رحیم جان رحیم عظیم آبادی کی طرف سے شایع کیا۔

ادھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر عظیم آبادی چشم دید گواہوں سے دستخط لے رہے تھے کہ شاد شاگرد صفیر بلگرامی ہیں۔ چند گواہوں کے نام یہ ہیں:- محمد وجیہہ الحق۔ امیر الحسن عرف اُلفت حسین داناپوری۔ الیاس حسین۔ امداد حسین۔ شیخ فرزند علی۔ شیخ تقی جان۔ سید الطاف حسین۔ سید شفاعت حسین ساکنان حاجی گنج۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناب شاد و جناب مطیر میں بول چال بند ہو گئی۔ آخر نواب محمد علی خاں نے صلح کرا دی۔ اس صلح کی خبر آرہ پہونچی تو صفیر بلگرامی نے جناب شاد کو یہ خط بھیجا:-

(۱۰۴) احبا جناب سید علی محمد صاحب شاد زاد لطفہ۔ تسلیم۔ تحریر احباب سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ سے اور جناب شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر سے جو اتفاقیہ ناچاقی ہو گئی تھی وہ بسعی و فہمایش جناب نواب مولوی محمد علی صاحب مدظلہ برطرف ہوئی۔ الحمد للہ والمنۃ۔ بخدا میرا جی بہت خوش ہوا..... میں نے اس صلح کا قطعہ تاریخ کہا ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ وہو ہذا ؎

فتاد صلح میان دو مومن خوشخو! — زہاے و ہوئے وسعی امیر ابن امیر
فگند طرح دلا با علی محمد شاد — بمہر شاہ حفاظت حسین کہ ہست مطیر
بگوش خرد چو ایں مژدۂ مسرت زای — چو گل شگفتہ شد از انبساط قلب صفیر

خیال مصرعِ تاریخ داشتم در دل سرود ہاتفِ غیبی خلوصِ شاد و مطیر

۱۲۹۶ھ

کاش اسی طرح میرے آپ کے بھی صلح ہو جائے تو میں حافظ کا یہ شعر پڑھوں ؎

شکر ایزد کہ میانِ من و او صلح فتاد حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

مگر یہ صلح بہت دشوار معلوم ہوتی ہے۔ خیر ؎ بیدل نیم ہنوز۔ ببینیم چہ می شود! ....."

۱۲۹۷ھ شیخپورہ ضلع مونگیر سے جناب شاد کے چھوٹے بھائی سید امیر حسن ایجاد نے صفیر بلگرامی کو خط بھیجا کہ بات بڑھ رہی ہے اب صلح ہو جانا چاہئے۔ صفیر بلگرامی نے اس کا مفصل جواب دیا۔ چند سطریں یہ ہیں :-

سعید زمن مولوی امیر حسن ایجاد سلمہ اللہ تعالیٰ ... ... آپ کا خط مورخہ چہارم محرم ڈاک سے پایا۔ اُس کو دیکھ کر دل بھر آیا۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے سب سچ ہے۔ اور جو کچھ خیال ہے سب راست ہے۔ افسوس! میں خود ان باتوں سے نادم ہوتا ہوں۔ اور پانی پانی ہوا جاتا ہوں۔ بھائی! میں تو بہت رُکتا ہوں۔ اور سنبھلتا ہوں۔ مگر کیا کروں؟ بعض باتیں اُدھر سے ایسی ہو جاتی ہیں کہ ناچار جواب دینا پڑتا ہے۔ خدا اس کا علیم ہے کہ میں نے باوجود یکہ برسوں بہت کچھ سُنا۔ اور بے اعتنائی اپنی آنکھوں بھی دیکھی مگر دم بخود رہا۔ کیونکہ مجھ سے تو کوئی نہیں بولتا تھا۔ کیا ضرور کہ میں دخل بیجا کرتا۔ اگر وہ (شاد) اپنی تعریف کرتے تھے تو میرے خوش ہونے کا مقام تھا۔ اگر وہ میری توہین کرتے تھے تو شنیدہ را اعتبارے چنداں نیست۔ سمجھ کر ناشنیدہ کر دیتا تھا۔ ... آخر کہاں تک؟ میرا منصب، جو میرے نزدیک کیا بہتوں کے نزدیک، بلکہ خدائے عادل کے نزدیک ہے۔ آخر مجھے غیرت میں لایا۔ اور روز روز کی ناشنیدنی سے جی گھبرایا۔ یعنی جب یہ سُنا کہ اُدھر اب انکار صاف ہے تو میں نے اپنی پرانی ردّیوں کو دیکھا بھالا اور جو کچھ زمانۂ شاگردی کا بندھا بندھایا رہ گیا تھا نکالا۔ اور اُس کا ایک مجموعہ درست کر کے شاہدین سے اُس پر دستخط لکھوایا۔ پھر بھی ان کو (شاد) کو خیال نہ ہوا۔ ایک بے تہذیب سے مل کر میری تہجین میں کوشش فرمائی ... معاذ اللہ مجھے اُن ملاعین سے مثال دی جن کے مقابلہ میں اُن کے اور میرے آبا طاہرین نے صبر کیا تھا ... جناب میر امیر حسن صاحب! حسبتہ للہ فرمائیے کہ ان سب باتوں کا جواب میری طرف سے کیا ہوا؟ خاموشی! ... آپ اگر صفائی چاہتے ہیں تو مجھے محال معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ میرا دعویٰ اسی قدر ہے کہ وہ (شاد) بقسم اقرار کر دیں کہ میں صفیر کا شاگرد ہوں ... جب تک شاہ صاحب (فریاد) کلکتہ سے نہ آئے تھے اُسوقت تک بخدا میرے سوا وہ کسی کو نہ دکھاتے تھے ... اس بات پر فیصلہ اگر ہو، اور وہ بھی علی رؤس الاشہاد ہو (کیونکہ یہ قصہ دور تک پہونچ گیا ہے، اُن لوگوں کو بھی اس سے آگاہ ہونا ضرور ہے) تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ رسوا ہو کر چپکے سے فیصلہ کر لینا غیرت قبول نہیں کرتی ....."

۱۲۹۸ھ رحلت حضرت شاہ اُلفت حسین فریاد عظیم آبادی۔ مصرع تاریخ سے "شاہ اُلفت حسین صدر جہاں" حیاتِ فریاد ص۱۸۹ میں مصرع تاریخ رحلت۔ شاہ الفت حسین فردوسی۔ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ۷ عدد زائد ہیں۔

۱۳۰۷ھ رحلت حضرت سید فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی۔ نعش عظیم آباد سے خشکی راستہ آرہ آئی۔ محامیر گنج میں پیوند خاک ہوئی۔ بتاریخ ۲۲ رمضان المبارک وقت شب ؎

اے شاد تم تو روتے تھے نکہت کے واسطے ایلو اعدم کو آج سدھارے صفیر بھی !

یہ وہی نکہت ہیں جن کے گھر میں جناب شاد حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اور یہ وہی نکہت ہیں جنھوں نے تصدیق کی تھی کہ "العبد سید دامو حسین نکہت۔ باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاد رو بروی من اصلاح چند از میر صفیر گرفتہ اند۔ انکار ازاں انحراف از ایمان است ....."

۱۳۲۹ھ اس سال بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ہم حضرت شاد عظیم آبادی کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے حضرت نے پوچھا آپ کون ؟ ہم نے کہا کہ نتائج اسلاف سید وصی احمد بلگرامی۔ حضرت نے پوچھا اسلاف کون ؟ ہم نے کہا کہ جدی مرحوم و مغفور حضرت صفیر بلگرامی۔ حضرت کی آنکھوں نے کہا ؎ اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری !

حضرت کی زبان نے کیا کہا اس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ مگر حضرت نے قلم نے کیا کہا اس کا مختصر بیان یہ ہے :—

مکتوبات شاد عظیم آبادی بنام سید وصی احمد بلگرامی

(۱)

چشم و جان شاد۔ آپ کا خط مورخہ ۲۸ جولائی مجھ کو ابھی ملا۔ میں خود بھاگلپور اب تک نہیں جا سکا۔ حالت یہ ہے کہ مجھ کو پہلے بخار آیا۔ پھر اسہال و اختلاج قلب میں حد سے زیادہ پریشان رہا۔ آپ جانتے ہیں کہ چراغ سحری کے لئے ذرا سے جھونکا ہوا کا کافی ہوتا ہے اور یہاں تو اس دفعہ سخت جھونکے تھے۔ برابر یہی یقین رہا کہ آج کا دن میری رخصت کا ہے۔ مگر خیر چونکہ اجل موعود میں وقفہ ہے اب کے بچ گیا۔

اور سچ یوں ہے کہ اس بچنے کی چنداں خوشی نہیں ہے۔ زمانہ کے ڈھنگ کو دیکھ کر ایسا کبیدہ خاطر ہو رہا ہوں کہ اب زندگی کو دل نہیں چاہتا جتنے خاندان پرانے اور باوقار تھے سب مٹ گئے۔ ان میں اگر کوئی ہونہار نوجوان بھی باقی رہ گیا ہے تو وہ بزرگوں کے نام و نشان و ملکیت کو اور بھی خاک میں ملائے جاتا ہے۔ ہر چند زمانہ خلاف دستور یہ کام نہیں کرتا۔ لیکن کیا کروں ؟ دل کو گوارا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ایسے ایسے خاندان والے اب ابھر رہے ہیں جنکے باپ دادا تک کو شریف کہتے ہوئے تامل ہوتا تھا۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔ میرے پیارے ! خدا کرے لم یزل میں ان مسرت بھری خبروں کو سنکر اسقدر خوش ہوا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ قرآن میں ہے۔ ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلہم ائمۃ ونجعلہم الوارثین — یہ آیت سورۂ قصص کے آخری وسط میں ہے ٹھیک اس کے مصداق آپ ہوئے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ ثم الحمد للہ۔ یہ بیچ میاں صاحب شفیقی سید اولاد حیدر رسلہ کے کون تھے (ہیں)۔ ان تعلقات کو ضرور لکھ بھیجئے۔

ایک نہایت ضروری اور واجب التعمیل بات یہ ہے کہ آپ پاس میرا وہ مرثیہ موجود ہے جو میرے قلم کا لکھا ہوا اور مرزا دبیر مرحوم کی اُس پر اصلاح ہے۔ مجھ کو قسم ہے اپنے آبا کرام کی کہ اگر آپ اس کو مجھے دو تین دنوں کے لئے دیں تو میں محض ایک نظر اس کو دیکھ کر فوراً واپس کر دوں گا۔ بیٹا! میں اس کو یا اور کسی ایسی چیز کو اب اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا۔ تم سے زیادہ اُس کا مستحق کون ہے؟ تم خوب جانتے ہو کہ سید ملہ جس قابل ہیں شاگردوں میں کوئی ایسا نہیں ہے۔ تم کو خدا نے محض اپنے تفضل سے ہر طرح کی قابلیت دی۔ الحمد للہ۔ پھر میں تم سے اگر کسی چیز کو عزیز کروں تو ہزار لعنت مجھ پر۔ دیکھو اگر تم نے واپسی ڈاک نہ بھیجا تو عذر کو بہانہ سمجھ کر سخت رنج ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ماشاء اللہ ڈپٹی کلکٹری کے کام سے آپ کو فرصت کہاں۔ مگر میں پھر کیا کروں؟ کیونکہ بخدا آپ سے زیادہ میری ناچیز تصانیف کا خبر گیر کون ہے؟ اور اگر ہو بھی تو یہ دلسوزی۔ محبت۔ قابلیت کس میں ہے؟ میری کتاب فکر بلیغ کا مسودہ جوں کا توں پڑا اٹھتا ہے۔ اگر یہ کتاب مرتب و شائع نہ ہوئی تو کچھ نہ ہوا۔ اسی پر دار و مدار میری تمام تصانیف کے چھپنے کا ہے۔ مگر ہنوز یہ کتاب حسب خواہ مرتب تک نہیں ہوئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا ہے کہ آپ پاس تھوڑا تھوڑا مسودہ لکھ لکھ بھیجتا رہوں۔ اور آپ اپنے قلم سے میرے حسب خواہ صاف کرتے رہئے۔ اور مجھ کو بھیجتے بھی جائیے۔

آخر کتاب میں آپ اپنے حسب خواہ وہ سب باتیں بھی پائیں گے جس کا ایما آپ نے اس خط میں کیا ہے۔ مرحوم میر قوت علی صاحب سے اس بارے میں میں کہہ چکا تھا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غش سے پاک صاف ہے۔ یہ کتاب اگر میری زندگی میں آپ کی محنت اور توجہ سے چھپ گئی تو شاید اس سے بڑھ کر میری خوشی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ انشاء اللہ غزلوں کی ترتیب کا بار بھی آپ ہی پر ہوں گا۔ خدا کرے میری یہ سب تمنائیں پوری ہو جائیں۔

اگر زندہ رہا تو آئندہ دوشنبہ سہ شنبہ کو بھاگلپور کا قصد ہے۔ وہاں سے آکر یا خود میں آرہ آجاؤں گا یا ایک دن کیلئے آپ کو زحمت دوں گا۔ لیکن آپ بلا کسی انتظار کے اول تو وہ مرثیہ بھیج دیجئے تاکہ میں قبل اپنے جانے کے دیکھ کر واپس کر دوں دوسرے میری کل باتوں کا مفصل جواب دیجئے ..... ہماری تمنا یہی ہے کہ تم کو خداوند کریم عمر طبیعی کو پہونچائے۔ دونوں بھائی پھلو پھولو۔ ہر طرح کی ترقی کرو۔ الٰہی آمین۔ ثم آمین۔ سید تسلیم کہتے ہیں۔ تمہارا بڑھا دعا گو

السید علی محمد شاد۔ از پٹنہ سٹی ۱۶ اگست ۱۸ء

اس اعزاز نامہ میں چند باتیں تشریح طلب ہیں:-

(۱) شاگردوں میں بھی ایسا کوئی نہیں ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ حضرت شاد کے ایک شاگرد نے اُن کے گھر میں آگ لگا دی۔ آگ لگانے سے مطلب یہ ہے کہ اور شاگردوں کو اُستاد کی نظروں سے گرا دیا۔ اس فتنہ پردازی میں اتنی بھی صلاحیت نہ تھی کہ میر عنایت حسین امداد عظیم آبادی اور سید علی حیدر رشید عظیم آبادی کی حد کو پہچان سکتا۔ یا پروفیسر

محمد مسلم عظیم آبادی۔ سید شاہ ولی الرحمن ولی ڈپٹی کلکٹر۔ سید شاہ خلیل الرحمن وفا عظیم آبادی وغیرہ کا کلام سمجھ سکتا مگر اسکی عیاریوں نے کسی کو ابھرنے نہ دیا۔ یہ شخص مہینوں اُستاد کے سر میں تیل ملتا۔ اُن کے پاؤں دابتا اور باورچی اتاکر اور جتنے شاگرد ہیں سب آپ کے دشمن ہیں۔ یہ دروغ مجسم اسی خلائی کے ذریعہ بادشاہت کرتا تھا یعنی کہنہ مشقوں کو ذلیل کرنے کے لئے خود حضرت شاد کی غزلیں مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھتا تھا۔ مگر بقول حضرت امیر مینائی ؎

ستارے دیکھے بھالے ہوئے ہیں ۔۔۔ یہ سب گیند اُن کے اُچھالے ہوئے ہیں

حیات فریاد ۱۶۴ میں حضرت شاد فرماتے ہیں :۔ "نئی زمانہ جو حرکات تلامذہ کے اپنے اُستادوں کے ساتھ ہیں کیا بیان کئے جائیں ؎

دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم ؟

۔۔ انشاء اللہ اگر موقع ملا تو اس بیان کو تفصیل وار کسی جگہ لکھ جاؤں گا تاکہ ناظرین کو حیرت و عبرت ہو" ——— اس فتنہ پرداز شاگرد کے ایک سو ستر ہاتھ تھے۔ ان میں دو ہاتھوں کا کرشمہ یہ تھا کہ ایک ہاتھ سے حضرت شاد کو اُن کے اور شاگردوں سے لڑا دیا اور دوسرے ہاتھ سے شعرائے عظیم آباد و آرہ کو خود حضرت شاد سے لڑا دیا۔ یہ جنگ برسوں رہی۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۲۳ء میں میدان جنگ کا نقشہ کیا تھا ملاحظہ ہو :۔

۶۸۶

طرحی مشاعرہ

مصلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مشاعرہ کا منشاء ہے کہ سخنگو اپنے کلام سنا کر محنت کی داد پائے اور حاضرین کو غیر جانبداری کا یقین آئے۔ سارے سخن گو بلائے جائیں۔ سب کا کلام سنا جائے۔ اور سب کی محنت کی داد بجائے خود پائی آئی۔ پھر مشاعرہ مشاعرہ نہ رہا۔ انھیں باتوں کو ملحوظ رکھ کر ایک صحبت مشاعرہ بتاریخ ۱۰ نومبر بوقت ۱۰ بجے شب بمقام بخشی محلہ پٹنہ قرار پائی ہے۔ اُمید کہ آپ بتاریخ و وقت معینہ بتشریف لاکر ملتمسین کو ممنون منت فرمائینگے۔

مصرع طرح :۔ ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے۔

قافیہ :۔ جدا۔ فدا۔ خدا۔ خدا وغیرہ ——— ردیف :۔ ہے

الملتمسین :۔ نظیر حسن شائق۔ ابوالقاسم دارثی مذکور نجم الدین نجم۔ رضی الدین حسن دہلوی خواجہ۔ عین الہدیٰ ثمر عزیز الدین بلخی ناز

۶۸۶

الحمد للہ کہ مشاعرہ کا حقیقی منشا عملی طور پر پہلے مشاعرہ میں جو ہدایتاً سن و خوبی کے ساتھ انجام پایا۔ کل حضرات نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ تمام اہل کمال اور ماہرین سخن سنج شریک بزم ہوئے۔ فنوس اور غیر جانبداری کے اعتبار سے یہ جلسہ جتنا کامیاب ہوا اسکے متعلق زیادہ عرض کرنا کافی ہوگا۔ شعرائے حاضرہ کو تکلیف بلا استثنا شریک جلسہ ہونے کی الحمد للہ کوئی وجہ شکایت پیدا نہ ہوئی۔ ان الذین آمنوا الخ اس بزم کو مفسدہ جلسہ اور توتو میں میں کے نقطہ سے تجزیہ کرنے میں کامل نہ کیا۔ دیا کہ جو اگا کی طرح ڈالی۔ ہر ذی علم لوگوں کے نام سے کر کے عام دعوت دیجاتی ہے کہ کل حضرات تنگ شعر سخن دیکھی ہوئی بیاض لے کر یکشنبہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۳ء روز شنبہ بوقت دس بجے شب بمکان مولوی سید عزیز الدین بلخی بخشی محلہ پٹنہ سٹی تشریف لاکر شریک بزم ہوں اور ملتمسین کو ممنون فرمائیں۔

مصرع طرح :۔ بزم اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے۔

قافیہ :۔ ضرورت۔ عجلت۔ وغیرہ ——— ردیف :۔ ہے

الملتمسین :۔ یقین احمد ثمر۔ سید شاہ سید۔ نظیر حسین شائق

یہ مشاعرے بخشی محلہ عظیم آباد میں ہوئے تھے۔ مصرع طرح کا روئے سخن حضرت شاد کی طرف تھا ؎

"ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے"۔ یعنی بزم شاد میں صرف شاد و شاگردانِ شاد کو داد ملتی ہے۔ اور خود نمائی کا تماشہ ہوتا ہے "بزم اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے"۔ یعنی بزم شاد میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ملتمسین کی فہرست میں دو نام خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ اول نظیر حسین شائق شاگرد حضرت شاد۔ اور دوم عین الہدیٰ ثمر شاگرد مولانا بدر آروی۔ اب دیکھئے کہ زمانہ حضرت صفیر بلگرامی کا انتقام حضرت شاد سے کس طرح لیتا ہے۔ شاد نے ۱۲۸۶ھ ہجری میں صفیر بلگرامی سے انحراف کیا تھا۔ اب پچپن برس کے بعد خود حضرت شاد کا شاگرد شائق عظیم آبادی آن سے ٹوٹ کر ملتا کس سے ہے شاگرد شاگرد صفیر بلگرامی یعنی حافظ سید عین الہدیٰ ثمر آروی سے۔ بہرکیف ان دونوں مشاعروں کے رقعے ہمکو بمکسر ضلع شاہ آباد میں ملے۔ مشاعرہ میں ہم خود شریک نہ ہو سکے۔ مگر ایک غزل بھیج دی جس میں یہ دو شعر بھی تھے ؎

جو داد کے قابل نہیں اس کو بھی ملی داد ا — "ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے"
ثانی منصب نہیں جو شاد سے روٹھے — شاگردِ صفیر آج تو تاج الشعرا ہے

مشاعرے میں ہمارے یہ دو شعر پڑھے گئے تو ایک شخص حضرت شاد کے پاس دوڑا گیا۔ اور کہا کہ دیکھئے صفیر بلگرامی کے پوتے نے اس مقطع میں پھر آپ کی شاگردی کا فسانہ چھیڑ دیا۔ مگر اس غریب کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس سے پہلے ہی ہم حضرت شاد کو براہ راست لکھ چکے تھے کہ اب آپ کو غور فرمانا چاہیئے کہ انحراف کا بوجھ اپنی گردن پر لے جانا آپ کے لئے مناسب ہے یا نہیں۔ اسی سوال کا جواب حضرت شاد نے ہم کو دیا تھا کہ :-

"آخر کتاب (فکر بلیغ) میں آپ اپنے حسب خواہ وہ سب باتیں بھی پائیں گے جس کا لکھنا آپ نے اس خط میں کیا ہے۔ مرحوم میر قوت علی صاحب سے اس بارے میں میں کہہ بھی چکا تھا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غش سے پاک صاف ہے ...."

اس جا میں میر قوت علی صاحب سے مراد حضرت میر امامی بلگرامی کے خلف میر قوت علی شورش بلگرامی، شاگرد صفیر بلگرامی ہیں۔ مرزا اوج لکھنوی (خلف میرزا دبیر) اور حضرت شاد اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں سے حضرت شاد نے اقرار کیا تھا کہ صفیر بلگرامی کی شاگردی سے ہمارا انحراف دراصل عالم شباب کا ایک شعبدہ تھا۔ یہی مطلب ہے اس فقرہ کا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غش (یعنی کدورت و خیانت) سے پاک صاف ہے ــــ حضرت شاد کا یہ خط ہم کو ۱۹۱۸ء میں آیا تھا۔ اس کے آٹھ سال بعد ہم ایک مرتبہ حضرت شاد کی زیارت کے لئے اُن کے درِ دولت پر حاضر ہوئے تو حضرت نے اپنے صاحبزادے سید حسن خاں سے فرمایا کہ مطبوعہ اوراق جو اُس کمرے میں رکھے ہیں ذرا وصی احمد کو دکھلا دو۔ وہ اوراق آئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک قطعہ میں حضرت شاد نے اپنے اُستادوں کو یاد کیا ہے اور اُس فہرست میں صفیر بلگرامی بھی ہیں۔ مگر ایک بیت کے مصرع ثانی میں مطبوعہ الفاظ یہ ہیں :- "..... صفیر اُستادِ فن بود"

اس فقرہ کا پڑھنا تھا کہ ہم کو حضرت ناسخ کا مصرع یاد آگیا ؎ خط وہ لکھتا ہے۔ پہ لکھنے نہیں دیتے ہیں رقیب ! یعنے

حضرت شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی کا اقرار کرنا چاہا بھی تو رقیبوں نے یہ ذلت گوارا نہ کی۔ اور ایک نقطہ سے اپنا کام نکال لیا۔ ہم نے حضرت شاد سے کہا کہ ذرا ان الفاظ کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ حضرت نے چشمہ طلب فرمایا اور اس بیت کو پڑھ کر فرمایا کہ غلط ہے۔ الفاظ یہ تھے۔ "صفیر اُستادِ من بود" ہم نے کہا کہ اپنے دست مبارک سے تصحیح فرما دی جائے تب حضرت نے قلم دوات منگا کر حاشیہ پر یہ ثبت فرمایا:۔ "این جا فنِ نیست۔ من است۔ السید علی محمد شاد"

حضرت شاد سے یہ دستاویز لیکر ہم اسی وقت بانکی پور گئے۔ اور بھائی صاحب مدظلہ العالی حاجی سید غلام [illegible] بلگرامی ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ لیجئے حضرت شاد نے قرض بیباق کر دیا۔ بھائی صاحب مدظلہ العالی نے فرمایا کہ اس دستاویز کو خدا بخش خاں صاحب کے کتب خانہ میں رہنا چاہئے۔ ہم نے کہا کہ ضرور۔ چنانچہ دوسرے دن حضرت شاد کا دو نوشتہ جناب مولوی ولی الدین خدا بخش خاں سکریٹری اورینٹل لائبریری بانکی پور کو سپرد کر دیا گیا۔

(۲) "آپ پاس میرا وہ مرثیہ موجود ہے جو میرے قلم کا لکھا ہوا اور مرزا دبیر مرحوم کی اس پر اصلاح ہے" یہ مرثیہ وہی ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ حضرت شاد کا یہ سب سے پہلا مرثیہ ہے۔ اور اس پر صفیر بلگرامی اور مرزا دبیر کی اصلاحیں ہیں۔ حضرت شاد کو اس کی زیارت تیرہ برس کے بعد نصیب ہوئی۔ یعنی یہ خط پاکر ہم مرثیہ لئے ہوئے پٹنہ گئے اور حضرت شاد کو سپرد کر آئے۔ چند ماہ کے بعد دوبارہ پٹنہ گئے اور مرثیہ لے آئے۔ یہ تبرک ہمارے پاس اب تک محفوظ ہے۔

(۲)

برخوردار نور چشم فضائل مآب سلمکم اللہ تعالیٰ۔

آپ کے تشریف لے جانے کے بعد مجھ کو زیر ناف سخت درد پیدا ہو گیا۔ رات تڑپ کر کٹی۔ تھوڑی دیر سے کچھ افاقہ ہے۔ جس ممو ریل کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے اُس کا ایک انگریزی مسودہ اور کچھ مضمون اس پر زیادہ کیا ہے۔ اردو میں وہ مضمون جاتا ہے پوری امید ہے کہ آپ ان مضامین کو اپنے طور پر انگریزی میں لکھ دیجئے۔ اور صاف کر کے اس دوشنبہ کے قبل میرے پاس روانہ کر دیجئے۔ دوشنبہ کے دن کمشنر صاحب کو دکھا کر چھپوانے کا ارادہ ہے۔ اور اگر آپ کی عنایت ہو گی تو انشاء اللہ دانوبر کو داخل کیا جائے گا..... اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں ترقی عطا کرے۔ آمین!

رقیمہ الدعا السید علی محمد شاد۔ ۱۷ نومبر ۱۸ء پٹنہ

(۳)

برخوردار نور چشم۔ بہتر از جان۔ طال عمرہ و انبالہ۔

بعد دعائے ترقی درجات کے واضح خدمت ہو۔ آپ جس دن سے مجھ کو دیکھ کر گئے ہیں میں سخت ضعیف و نڈھال ہو گیا ہوں۔ ظاہر از کام تھا۔ مگر تپاکِ قلب اور تحیر نے ایسا پریشان کر دیا ہے کہ چار سطر میں غور کر کے لکھنا محال ہے۔ وقت گزرا جاتا ہے۔ اگر میں جلد مر گیا اور خدانخواستہ وہ وقت قریب ہے تو ان ننھے بچوں کا کوئی کفیل نظر نہیں آتا۔

آخر دل اسقدر گھبرا گیا کہ بغیر ترتیب دئے اور صاف کئے مسودہ کے نوٹوں کو آپ کی خدمت میں بھیجنا پڑا۔ میرے عزیزوں اور شاگردوں کی تعداد دیکھنے والوں سے زیادہ ہے۔ مگر آج ایک بھی مددگار نظر نہیں آتا۔ خدا آپ کو ترقی عمر و اقبال دے محض آپ پر ہر قسم کا بھروسہ ہے۔

میں نے جو جو نوٹ جس جس قدر لکھے ہیں سب کو بھیج دیتا ہوں۔ سب کو ملاحظہ کر کے مسودہ جلد درست فرمائیے اولڈھم صاحب مارچ تک چلے جائیں گے۔ اس سے زیادہ آپ سے کیا گزارش کروں ..... اب آپ خود سمجھ لیجئے مجبور بوڑھے بیمار کو تکلیف نہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ تم کو سلامت رکھے۔ دعاگو السید علی محمد شاد۔ ۴ جنوری ۱۹ء

(۴)

برخوردار سعادت اطوار۔ والا ودمان سلمکم اللہ تعالیٰ

بعد سلام شوق و ترقی عمر و اقبال واضح خدمت ہو۔ چند روز ہوئے کہ میرے غمخوار۔ دل نواز۔ شفیق۔ بے ریا مولوی بشیر صاحب نے مشاعرہ کا اشتہار میرے پاس بھجوایا۔ اس کو دیکھ کر کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوئی۔ آٹھ مہینے کامل گزر گئے کہ اس عارضہ قدیمہ یعنی وحشت و اختلاج قلب نے کیسی حالت بنا دی۔ اور اور باتیں ایک طرف۔ لکھنا پڑھنا۔ دروازہ سے باہر نکلنا سب چھوٹ گیا۔

علاوہ اس کے میں مدتوں سے ترک مشاعرہ کر چکا۔ نہ میں قابل مشاعرہ رہا۔ نہ مشاعروں کی حالت ایسی ہے کہ شریف شریک ہونا گوارا کریں۔ مگر ساتھ اس کے اللہ اکبر آرہ! اور پھر مولوی صاحب سلمہ کا اس محبت سے بلانا۔ اور میرا نہ جانا بھی کچھ کم میرے لئے باعث صدمہ عظیم نہیں ہے۔

آپ یہ ملاحظہ کریں کہ میرے پاس مدتوں سے ایک ٹوٹا پریس پڑا تھا۔ اس کی مرمت کر کے ڈین صاحب کلکٹر سے اجازت مانگی۔ انھوں نے بلا ضمانت اجازت تو دی مگر یہ کہا کہ میں قانون سے مجبور ہوں۔ حسب قاعدہ دو منٹ کے لئے وہ آکر خود افیڈیفٹ کر جائیں۔ مگر اس کمبخت عارضہ کے سبب سے میں جا ہی نہ سکا۔

یہاں ایک تاجر بڑے نامی ہیں۔ منت خاں۔ ان کے بھتیجے چھنگے خاں نے سخت اصرار کر کے چاہا کہ اپنے خرچ سے کل میری تصانیف چھپوا دیں اور کوئی دقیقہ اصرار کا اٹھا نہ رکھا۔ میں نے مجبور ہو کر اقرار بھی کر لیا۔ پہلے انھوں نے یہ خبر نہیں دی تھی کہ کس مطبع میں چھاپیں گے لیکن چونکہ ان کے بہت روپے آرہ کے مطبع "——" کے ذمہ باقی ہیں دبیں بات چیت طے کرنی تھی۔ جب مجھ کو یہ معلوم ہوا ..... تو مجھ کو اس نمک حرام کے مطبع میں چھپوانا گوارا نہ ہوا۔ چھنگے خاں کو تو اپنے روپئے وصول کرنے تھے۔ خاموش ہو بیٹھے۔ اور مجھ سے بہت لوگوں نے کہا کہ آپ کو کیوں ایسی کد ہے مجھ کو یہ بھی گوارا نہ ہو سکا کہ پرانا قصہ لے بیٹھوں۔ صرف یہی جواب دیا کہ وہ نہایت وعدہ خلاف شخص ہے۔ میں نے عہد کر لیا ہے کہ چاہے مفت چھاپے مگر میں وہاں ہرگز نہ چھپواؤں گا۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔

اب پھر مشاعرہ کا ذکر کرتا ہوں۔ چند دن سیدس جیسا ہوں اگر ایسا ہی رہا تو آنکھوں سے حاضر ہوں گا۔ اور اگر خدانا کردہ دل قابو میں نہ رہا تو ریل پر دو گھنٹہ گھوٹ کر رہنا ہی ستم ہے۔ ورنہ پٹنہ اور آرہ میرے لئے دونوں برابر ہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ بصورت حاضری میرے پڑھنے کے لئے ایک مجلس عزا کا ہونا ضرور ہے۔ پندرہ برس اُدھر اگر میں کسی جگہ مشاعرہ میں گیا ہوں تو پہلے ہی یہ نیت کر لی ہے۔ اگرچہ اب میری حالت ایسی نہیں ہے کہ حسب خواہ مجلس پڑھ سکوں مگر اس کو سعادت اور برکت جانتا ہوں اور یہ کل اُمور جب ہی باعث دلچسپی ہوں گے جب آپ آرہ میں تشریف رکھتے ہوں گے۔ ابھی تک میں نے مولوی بدر صاحب کو خط تک نہیں لکھا ہے۔ آپ کا خط پانے کے بعد البتہ جواب لکھوں گا۔ والسلام۔ دعاگوئے شما السید علی محمد شاد۔ ۲۳ اکتوبر ۲۰ء پٹنہ سٹی

اس خط میں دو فقرے تشریح چاہتے ہیں مگر تشریح کا موقعہ نہیں :۔

(۱) "اللہ اکبر آرہ! اس فقرہ پر مولانا جامی علیہ الرحمہ کا ایک مصرعہ بے اختیار یاد آگیا ؎

مرا کشتی و تکبیرے نگفتی — چہ سنگیں دل کسی۔ اللہ اکبر!

تو نے ہم کو ذبح کیا اور تکبیر تک نہ کہی۔ تو بھی کتنا سنگدل ہے۔ اللہ اکبر!

(۲) "مجھ کو اُس نمک حرام کے مطبع میں چھپوانا گوارا نہ ہوا" نمک حرامی ایک شخص نے در اصل حضرت صاحب مغفور بلگرامی کے ساتھ کی تھی۔ اس لئے شاگرد کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ جس نے اعتماد کے ساتھ نمک حرامی کی اس کے مطبع میں اپنا کلام طبع کرائے۔

(۵)

جان و دلِ شاد بقربان شما۔ ایک ہفتہ سے زیادہ ہوا کہ آپ کا گرامی نامہ باعث قوت دل حسرت منزل ہوا تھا کتابوں کی نسبت کیا عرض کروں۔ ایک ہفتہ سے یہی ہو رہا ہے کہ کل چاروں کا ایک ایک جزو طیار ہو جائے گا۔ مگر کوئی نہ کوئی بکھیڑا اٹکل آتا ہے۔ شاید اب اتوار تک طیار ہو کر آپ پاس روانہ ہو جائے..... بھائی! اس عمر اور دھڑکن اور ضعف نے مجھ کو مار ڈالا ہے۔ اس پر مسودہ دیکھنا۔ کاپی دیکھنا۔ پروف دیکھنا۔ اور پھر مختلف مضامین پر نظر رکھنا۔ خدا اہلِ علم و فن میں عزت رکھے..... اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور درجہ اعلیٰ پر پہونچائے کہ دیکھکر اور بھی دل خوش ہو۔ میں تو اسوقت بھی فخر کرتا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ تمہارے پاؤں کی خاک اپنی آنکھوں سے لگایا کروں۔

تمہارا خاکسار السید علی محمد شاد۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۲۰ء

اس خط میں چار کتابوں سے مراد ریاض عمر۔ چشم بصیرت۔ فکر بلیغ۔ اور آئینہ انقلاب ہیں۔ ریاض عمر دیوانِ غزلیات۔ چشم بصیرت کلیات مولود و مراثی۔ فکر بلیغ تذکرہ مرثیہ گویاں۔ آئینہ انقلاب تاریخ صوبہ بہار۔ اشتہار کی سرخی یہ تھی ؎

آزمالیوں بھی اس گرتے ہوئے بازار کو — شاد بیچو توڑ کر ان موتیوں کے ہار کو

موتیوں کے ہار توڑ کر اس طرح بکے کہ ایک ایک جزو چاروں کتابوں کے بیک وقت شائع ہوئے۔ افسوس کہ حضرت شاد کی مجبوریوں اور زمانہ کی ناقدری نے یہ سلسلہ بھی موقوف کر دیا۔ ورنہ ریاضِ عمر کا سرنامہ بالکل بجا و درست تھا۔ سرنامہ یہ تھا

تن دیدہ اند از من و جانم ندیدہ اند — نامم شنیدہ اند و نشانم ندیدہ اند
آنہا کہ آورند مرا در نظر حقیر — بر آستانِ میکدہ شانم ندیدہ اند
آناں کہ سرکشند ز نخوت بر آسماں — بیچارگاں بکوئے مغانم ندیدہ اند

حضرت شاد کا دیوان جو شائع ہوا ہے وہ بالکل ناقص ہے۔ یہی حال فکر بلیغ کے اُس حصہ کا ہے جو رحلت حضرت شاد کے بعد شائع ہوا۔ مجروح کبوتر کو دیکھنا ہو تو ان دونوں کتابوں کو دیکھئے۔

(۶)

نورِ چشم سراپا قابلیت۔ سراپا احسان۔ مولوی سید وصی احمد صاحب طال عمرہ و اقبالہ۔ بعد سلام شوق و دعائے مخلصانہ ترقیات التماس یہ ہے کہ ہر چند آپ کو تکلیف دیتے ہوئے سخت حجاب آتا ہے۔ مگر الغرض مجنوں۔ کیا کروں؟ حالت یہ ہے کہ اس دفعہ حسب ایمائے سر فخر الدین صاحب ایک میموریل میں نے پھر گورنمنٹ میں دیا تھا۔ کمشنر نے دیا تھا۔ اُس نے میرے بیان کی تحقیقات کی۔ کلکٹر نے سٹی مجسٹریٹ کے پاس بھیجدیا۔ سٹی مجسٹریٹ نے نہایت حسب خواہ رپورٹ کیا۔ مگر اتنا کہ دیا کہ سات سو سالانہ جمعبندی کا ایک گاؤں بھی ہے جس کی آمدنی بسبب دفعہ ۱۰۹ اور اسامیوں کے جھگڑے نے چار برس سے بندار قرض سودی اس پر پانچ ہزار ہے۔ کلکٹر نے یہ رپورٹ دیکھا (از بسکہ سر رشتہ انفس مشہور ہے) برخلاف لکھا۔ مگر پھر کمشنر نے اپنی رپورٹ میں سفارش لکھ دی۔ سر فخر الدین نے شاید اس انگریزی ممبر سے جو ایسے کاغذات دیکھتا ہے سفارش بھی کی۔ مگر اس کلکٹر نے بقول اُن کے کچھ زبانی جا کر ایسا کہا کہ ناکامیابی ہوئی۔

بجز تحقیقاتی رپورٹ کے اور کاغذوں کی نقل آپ کی خدمت میں جا رہی ہے۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ اگر کوئی صورت لڑکوں کے لئے وظیفہ کی نہ نکلی تو اُن کی تعلیم دشوار ہے۔ سر فخر الدین نے کہا کہ اس دفعہ صرف لڑکوں کی تعلیم میں معقول مدد ملنے کی استدعا کیجئے۔ چونکہ اس کو ایجوکیشن سے تعلق ہے شاید حکم آخر کے لئے میرے پاس آئے گا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا موریل کس سے لکھوایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یاد آتا ہے کہ مولوی سید وصی احمد صاحب سے آپ نے ایک موریل لکھوایا تھا۔ وہ سب سے بہتر تھا۔ انھیں سے لکھوائیے۔

میں نے اس پیری و نابینائی میں کئی مسودے کئے۔ پھر استخارہ کیا۔ تو واجب یہی آتا ہے کہ آپ لکھئے۔ اور ضرور لکھئے اور پھر ٹائپ کروا کر ہر طرح مرتب کر کے، جلد بھیجدیجئے۔ سر فخر الدین اوائل مئی میں رانچی چلے جائیں گے

سپردم بتو مایۂ خویش را

مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ موریل بھی کمشنر کے ذریعہ سے جائے گا یا اور کسی کے۔ بہر حال یہ کام آخر عمر کا جلد کر دیجئے

درست بستہ گزارش ہے کہ جلد مرتب کر دیجئے۔ اگر ضرورت لڑکوں کے نام کی ہو تو ذیل میں لکھتا ہوں :-
سید سلطان احمد خاں - عمر ۹ سال - جارج ام - ای - اسکول میں ساتویں کلاس میں پڑھتا ہے۔
سید نقی احمد خاں - عمر ساڑھے سات .. ..

دعاگو السید علی محمد شاد - پٹنہ سٹی - ۲۲ اپریل ۲۶ء

اس خط میں سر فخر الدین کی زبانی جس مموریل کا حوالہ ہے، اُس میں ہم نے حضرت شاد کی طرف سے لکھا تھا کہ گورنمنٹ سال میں لاکھوں روپئے آثار قدیمہ پر صرف کرتی ہے، کیا تعجب ہے کہ گورنمنٹ نے آثار قدیمہ کی فہرست میں اب تک شاد عظیم آبادی کا نام درج نہیں کیا۔ یہ مموریل پہونچا تو گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ حضرت شاد کے لئے عطا فرمایا۔ یہ وظیفہ نو سال تک جاری رہا۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں موقوف ہوا، جب حضرت شاد نے رحلت فرمائی، اور سمع شاعری ہمیشہ کے لئے خموش ہو گئی ؎

سکھی! سنیو میری کہانی میں تو بھئی ہوں بر با دیوانی

وصی احمد بلگرامی - بی - اے

مجموعۂ استفسار و جواب ہر دو جلد

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی جلدیں ہیں جن کے ... صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے، ان میں تقریباً ۴۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملے گا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا، چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو :-
مسئلۂ جبر و اختیار - خواب کی حقیقت - معاد و خلود - طبقۂ نسواں اور غزلگوئی - برج بابل - فاسمسٹ جماعت سامری کون تھا - باغ ارم کی حقیقت - فلسفۂ محبت - بھوت پریت - اصحاب کہف - سالویشن آرمی - ہالہ کا سبب - معجزہ و کرامات - فرقۂ معتزلہ - مذہب و عقل - طوفان نوح - یاجوج و ماجوج - برہمو سماج - طبقۂ نسواں اور تعلیم - مریخ کی حقیقت - منصور حلاج - چند الفاظ کی تحقیق - اصطلاحات تصوف کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ
قیمت ہر دو جلد معہ محصول خریداران نگار سے ۶/ للعہ - غیر خریداران سے ۶/

منیجر نگار - لکھنؤ

چین و جاپان کی مخاصمت

چین کی مدافعانہ کارروائی

گزشتہ مضمون میں میں بیان کر چکا ہوں کہ جاپان آہستہ آہستہ اپنے قدم منچوریا میں مستحکم کر رہا ہے۔ لیکن اُدھ قومیت پسند چینیوں نے بھی ایک پروگرام بنایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ منچوریا کو تمام خارجی موثرات سے پاک و صاف کر دیا جائے۔ اُن کا یہ پروگرام پہلے تو صرف انگریزوں کے خلاف بنایا گیا تھا لیکن بعد میں جاپانیوں کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ اس مقصد کے لئے اُن کے دو ہتھیار اقتصادی مقاطعہ اور عالمگیر پروپیگنڈا ہیں اور وہ اپنی رہنمائی کے لئے زیادہ تر روسیوں کے [illegible] ہیں۔ پہلے تو حکومتِ جاپان نے چاہا کہ صلح و صفائی سے معاملہ کا تصفیہ کر لیا جائے۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ حالات کسی طرح درست نہیں ہوتے تو اُس نے نوٹس دیدیا کہ اگر چینی اپنی حرکات سے باز نہ آئے گا تو وہ چار ہاتھ کر لے گا۔ چین کا خیال تھا کہ اقتصادی مقاطعہ اُس کے پاس ایسا ہتھیار ہے جس کے رعب سے جاپان اپنے تمام حقوق چھوڑنے پر تیار ہو جائے گا لیکن اُس کو خیال نہ رہا کہ جاپان میں ایک ایسی پارٹی بھی موجود ہے جو اپنے اقتصادی اقتدار کو سیاسی مفاد کی خاطر قربان کر سکتی ہے۔ پھر منچوریائے چینی ڈکٹیٹر کا خیال تھا کہ اگر مکڈن کے مقام پر ایک بارود خانہ بنا لیا جائے تو صرف دو لاکھ آدمیوں کی امداد سے جاپان کو منچوریا کے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُسوقت منچوریا میں جاپان کی فوج صرف گیارہ ہزار تھی۔ لیکن ۱۸۹۴ء کی طرح ۱۹۳۱ء میں بھی چینیوں کی تجاویز کاغذی پیراہن سے باہر نہ نکل سکیں اور جاپان نے اس دفعہ بھی اقدار کی۔ جاپان کی بے چینی اس وجہ سے بھی بڑھ گئی کہ ۱۹۲۹ء میں چینی فوجوں نے مشرقی چینی ریلوے کو اپنے قبضہ میں کر لیا جس کو بچانے کے لئے روسی فوج کو مداخلت کرنی پڑی۔ اُسوقت تو معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن اُس کے بعد روس و چین کے درمیان سیاسی گفت و شنید شروع ہوئی جو دسمبر ۱۹۳۲ء تک جاری رہی۔ قدرتی طور پر اس سے جاپان کو خطرہ پیدا ہوا اور وہ منچوریا میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے لئے اور بھی زیادہ متفکر نظر آنے لگا۔

ریل گاڑیوں کے جھگڑے

چین اور جاپان کی باہمی مخاصمت ۱۹۳۱ء کا سبب زیادہ تر وہ ریل گاڑیاں ہیں جو کوریا اور منچوریا وغیرہ میں موجود ہیں۔ دونوں حکومتیں یہ چاہتی ہیں کہ یہ

ریل گاڑیاں کلی طور پر اُن کے قبضہ میں آجائیں تاکہ سیاسی اور اقتصادی طور پر اُن کا اقتدار ہوجائے۔ معاہدات ۱۹۱۵ء کی رو سے علاقہ کوان ٹنگ کے ٹھیکہ کی توسیع ۱۹۹۷ء تک جنوبی منچورین ریلوے کی ۲۰۰۲ء تک اور این ٹنگ کرن ریلوے کی ۲۰۰۷ء تک کردی گئی تھی۔ لیکن چینیوں کا خیال ہے کہ یہ معاہدے بالکل ناجائز تھے کیونکہ ان کی اجازت نہ تو پارلیمنٹ چین سے لی گئی اور نہ یہ طرفین کی رضامندی سے معرضِ عمل میں آئے۔ مگر جاپان ان دونوں دلائل کی تردید اس طرح کرتا ہے کہ بین الاقوامی قانون کی رو سے ایسا معاہدہ جو دھمکی سے کسی حکومت کے ساتھ کیا جائے، بالکل جائز ہے۔ اگر تمام معاہدات سیاسی گفت وشنید ہی کے ذریعہ سے طے پائیں تو شاید کوئی معاہدہ بھی جائز نہ ہو۔

پھر بعض ریلیں منچوریا میں ایسی ہیں جو جاپانیوں نے اپنے خرچ پر ہیں لیکن اُن کا نظم ونسق اب تمام چینیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جاپانیوں کی شکایت ہے کہ چینیوں نے دو روپیہ واپس نہیں کیا جو ریلوے لائنوں کے بنانے میں صرف ہوا اور اس لئے وہ اُن کے انتظام میں رخنہ ڈالتے ہیں۔

پھر چینیوں نے بعض اپنی ریلوے لائنیں بھی بنائی ہیں جو ساؤتھ منچورین ریلوے اور اُس کی شاخوں کا براہ راست مقابلہ کرتی ہیں۔ اگر یہ اسکیم پوری طرح مکمل ہوجائے تو جاپانی ریلوں کی تجارت چینی ریلوں کی طرف منتقل ہوجائے اور اس کا اثر بندرگاہ ڈیرن کی تجارت پر بھی پڑے گا۔ جاپان نے اس اسکیم کے خلاف متواتر آواز اُٹھائی لیکن سب بے اثر رہی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو ساؤتھ منچورین ریلوے پر ایک بم پھینکا گیا۔ جس کو چین وجاپان کی باہمی آویزش کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ اسی طرح ہے جس طرح آرک ڈیوک فرڈیننڈ کے قتل کو جنگ عظیم کی بنیاد کہا جائے۔ دراصل اس مخاصمت کی اصل وجہ وہی ریلوں کا جھگڑا ہے جو میں اوپر بیان کرچکا ہوں۔ اور منچورین لائن پر بم نہ بھی پھینکا جاتا تو کوئی اور عادثہ یہ فتنہ اُٹھانے کے لئے کافی تھا۔

لیگ آف نیشنز کی مداخلت

ان حالات کی وجہ سے جمعیت الاقوام کی مداخلت ضروری ہوگئی اور اُس نے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا جس کو لٹن کمشن کہتے ہیں۔ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں جاپان کی کارروائی سراسر جارحانہ تھی اور اس لئے جاپان کو لازم ہے کہ وہ اپنی فوجیں منچوریا سے سوائے ریلوے کے علاقہ کے فوراً ہٹالے اور نیز قرار دیا کہ منچوکو جو چین کے خلاف منچوریا میں ایک ریاست بن گئی تھی۔ محض جاپانی فوج کی "ساختہ کٹ پتلی" ہے اور اس لئے اُس کو کوئی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ امریکہ متحدہ نے جو لیگ کا ممبر نہیں ہے، اس رپورٹ کی حمایت کی۔ لیکن اس کے برخلاف جاپانیوں کا تنازعہ تھا کہ جو کچھ انھوں نے کیا صرف مدافعت کی بنا پر تھا اور اس لئے انھوں نے معاہدۂ لیگ یا عہدنامۂ پیرس کی

خلاف ورزی نہیں کی۔ اُن کا یہ بھی اصرار تھا کہ منچوکو باشندگانِ منچوریا کی اپنی تحریک آزادی کے ماتحت مترتب ہوئی ہے اس لئے اُسے حکومتِ جاپان کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں پھر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ جاپان نے چین کے سیاسی وقار کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ صرف اُن حالات کی طرف توجہ کی ہے جو منچوریا کے بعض اشرار نے پیدا کر دئے تھے۔ ہر چند یہ صحیح ہے کہ منچوکو بغیر جاپانی افواج کی امداد کے معرضِ ظہور میں نہیں آسکتی تھی مگر یہ بھی غلط نہیں کہ منچوریا کے اکثر لوگ جو چینی رؤسا کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے جاپان کے طرفدار تھے۔ جب جمعیت اقوام نے جاپان کی دلائل کی کوئی پرواہ نہ کی تو وہ اُس سے مستعفی ہو گیا۔

اس عرصہ میں جاپانیوں نے مخالفین منچوکو کی کئی فوجوں کو پسپا کیا اور جہول کے علاقہ کو فتح کر لیا اور بالآخر چینیوں کو ایک عارضی صلحنامہ کرنا پڑا۔ اب جاپان اپنے نئے علاقہ کو فروغ دے رہا ہے اُس نے وہاں کی ریلوں کا نظم ونسق درست کیا ہے۔ منچوریا کے مالیات کو سنبھالا ہے اور رہزنوں کے پے در پے حملوں کا خاطر خواہ بندوبست کیا ہے۔

روس کا رویہ

۱۹۳۱ء سے روس کے رویہ کے متعلق بہت کچھ قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ مشرقی چینی ریلوے اور ولاڈی وسٹک وغیرہ کو خطرہ میں دیکھ کر جاپانیوں کا شمالی منچوریا پر قبضہ برداشت نہیں کرے گا مگر حیرت ہے کہ وہ اب تک خاموش رہا بلکہ اُس نے منچوکو کی حیثیت کو بھی تسلیم کر لیا اور مشرقی چینی ریلوے میں اپنے بہت سے حقوق سے بھی دستبردار ہو گیا ہے۔ اس کے اسباب غالباً یہ معلوم ہوتے ہیں کہ روس کو اپنی اندرونی مشکلات اسقدر درپیش تھیں کہ وہ کوئی عملی کارروائی کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ دوسرے اُس کا خیال ہے کہ اگر "سرمایہ دار حکومتوں" میں لڑائی شروع ہو جائے تو سوویٹ یا کمیونزم کو بالآخر فائدہ ہوگا۔ بدقسمتی سے اس اندازہ کے درست ثابت ہونے کا احتمال بھی ہے کیونکہ اگر لیگ جاپان کے خلاف اقتصادی مقاطعہ کا اعلان کر دے تو قدرتی طور پر وہ اس کا مقابلہ چین کے خلاف بحری رکاوٹوں سے کرے گا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہوگا۔ امریکہ اور جاپان کے تعلقات پہلے ہی بگڑ رہے ہیں کیونکہ امریکہ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ "کھلے دروازے" کی پالیسی کے سوا کچھ برداشت نہیں کرے گا نیز اُس نے جاپان کو تنبیہ کیا کہ معاہدۂ واشنگٹن کی رو سے وہ بحرالکاہل میں ایک خاص نسبت سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتا۔

مشرقِ اقصیٰ کی نازک حالت

الغرض جاپان کو نہ صرف چین اور منچوریا کے مسائل درپیش ہیں بلکہ اُسے بحری طاقت کا سوال بھی حل کرنا ہے اور اسی وجہ سے جاپان کی حالت نازک ہو رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دو سال کے بعد جب لیگ سے جاپان کی علٰحدگی قانونی طور پر پختہ ہو جائے گی تو بحرالکاہل کے جزائر جن پر آج کل فوجی اقتدار ہے کسی اور حکومت کے سپرد کر دئے جائیں گے۔

لیکن جاپان اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اُس کا دعویٰ ہے کہ وہ ان جزائر کو ۱۹۱۷ء کے عہدنامہ کی رو سے اپنے اقتدار میں رکھ سکتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں اُس نے وہاں اپنے ارادوں کی مضبوطی دکھانے کے لئے فوجی نمائش بھی کی۔ اور پھر جنیوا کو ایک نوٹس بھی بھیجا کہ ۱۹۳۶ء میں جب "بحری عہدنامۂ لندن" ختم ہوگا تو وہ اپنی بحری فوج زیادہ کردے گا بلکہ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ برطانیہ عظمیٰ اور ریاستہائے متحدہ کے مقابلہ میں اپنی بحری فوج کو اُن کے برابر کرلے۔ اس اثنا میں اُس نے باوجود اقتصادی اور مالی مشکلات کے بحری اور فوجی اخراجات بھی زیادہ کردئے ہیں۔ پریزیڈنٹ امریکہ ابھی اپنے اقتصادی بہتری کے پروگرام میں مصروف ہے اس لئے اُنہوں نے مشرقِ اقصیٰ میں اپنی پالیسی کے متعلق کچھ اعلان نہیں کیا۔ مگر یہ کہہ دیا تھا کہ امریکہ کا بحری بیڑہ عہدنامہ کی مقررہ نسبت تک پورے طور پر بڑھا دیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جو صورتِ حال مشرقِ اقصیٰ میں اسوقت پیدا ہو رہی ہے اُس کے شگون اچھے نہیں ہیں۔ اور اگر حالات یہی رہے یعنی لیگ منچوکو کو حیثیت دینے سے انکار کرتی رہی اور جاپان منچوکو کی حمایت کرتا رہا۔ یا اگر بحری طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف مسلح ہوتی رہیں تو ایک خطرناک جنگ کا روکنا سخت دشوار ہوجائے گا۔ طرفہ یہ کہ اس جنگ سے بحرالکاہل کی کسی طاقت کو فائدہ نہیں ہوگا بلکہ اگر ہوگا تو صرف سوویٹ روس کو۔

عبدالرحیم نشتر

نگار کے پرانے پرچے

حسب تفصیل ذیل موجود ہیں اور علاوہ محصول اس قیمت پر مل سکتے ہیں جو درج کی جاتی ہیں:۔

(۲۲ء) ستمبر و اکتوبر ۴ر فی پرچہ۔ (۲۳ء) مئی ۴ر۔ (۲۴ء) جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، اگست ۴ر فی پرچہ۔ (۲۶ء) جنوری، جون، اکتوبر، نومبر ۴ر فی پرچہ۔ (۲۷ء) اپریل، مئی، جون ۴ر فی پرچہ (۳۰ء) مئی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۴ر فی پرچہ۔ (۳۱ء) مارچ، جولائی، اگست ۴ر فی پرچہ۔ (۳۳ء) فروری، جولائی، اکتوبر، دسمبر ۶ر فی پرچہ۔ (۳۴ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، اکتوبر ۶ر فی پرچہ (۳۵ء) فروری، مئی، جون، جولائی، اگست دسمبر ۸ر فی پرچہ۔

۳۲ء جنوری (غالب نمبر) ۱۲ر فروری تا دسمبر علاوہ اپریل ۴ر فی پرچہ مینیجر نگار۔ لکھنؤ

بیوہ اور اس کا اکلوتا بیٹا

ایک انگریزی آبادی میں اتوار کے دن کے سکون آمیز تعطل و خموشی کو اُن لوگوں نے ضرور محسوس کیا ہوگا جو اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے عادی ہیں، کارخانوں و فیکٹریوں کا شور و ہنگامہ چکیوں کی پُر شور مسلسل آواز، لوہار کے ہتھوڑے کی کرخت کھٹ کھٹ، کسانوں کا مست و بیخود کرنے والا ترنم، بیل گاڑی کے چلنے کی لاتمناہی "رٹ رٹ" اور اسی قسم کی اور دوسری آوازیں جن کا تعلق دہقانی زندگی یا کاشت و مزدوری سے ہے بالکل غائب ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کھیتوں کے رکھوالے کتے بھی نسبتاً کم بھونکتے ہیں کیونکہ مسافروں کی چہل پہل اُن کے آرام میں مخل نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر میں نے ہواؤں تک کو خاموش محسوس کیا ہے اور اُس نورانی فضا کو جس کی تازہ و شاداب بہری آہستہ آہستہ نیل گوں دھندلکے میں تحلیل ہو جاتی ہے، ایسے موقعہ پر غایت درجہ سکون آفریں پایا ہے۔

دراصل نہایت مبارک تھا یہ فیصلہ کہ عبادت کا دن تعطیل کا دن بھی ہونا چاہئے، وہ پاک و مقدس سکون جو اتوار کے دن تمام فضا پر محیط ہوتا ہے اپنا ایک مخصوص اخلاقی و روحانی اثر رکھتا ہے۔ ہماری ہر بے چین آرزو مسرت و سکون میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ہم اپنے قلب و روح پر ایک خاص قسم کے فطری مذہب کا اثر محسوس کرتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جو احساسات لطیف مجھ پر گاؤں کے ایک گرجا میں جہاں حسین فطرت اپنا آغوش دل کے تمام فضا کو ایک مستقل سکون میں تبدیل کر دیتی ہے، طاری ہوتے ہیں کسی دوسری جگہ نہیں ہوتے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتوار کے دن اگر میں زیادہ مذہبی نہیں ہو جاتا تو کم از کم اور دوسرے دنوں کے مقابلہ میں ایک بہتر انسان ضرور بن جاتا ہوں۔

حال ہی میں جبکہ میں گاؤں کی پُر لطف زندگی بسر کر رہا تھا، میں اکثر ایک قدیم گرجا میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ گرجا کے تنگ و تاریک بغلی راستوں اور اُس کی شکستہ دیواروں پر دھندلے نقش و نگار نے گرجا کی ہر شے میں ایک ایسی تقدس آمیز بزرگی پیدا کر دی تھی لیکن چونکہ یہ عمارت ایسے پڑوس میں واقع ہوئی تھی جہاں ریاست و امارت اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر تھی، اس لئے تصنع اور شانِ امارت اس عبادت گاہ کے ذرے ذرے میں سرایت کر گئی تھی۔ بلکہ جب کبھی میری نظر عبادت گزاروں کے مجمع پر پڑتی اور اُن کے بے جا تصنع اور تزئین کا خیال آتا تو

دیر تک دنیا اور متعلقاتِ دنیا میری نظروں کے سامنے چکر لگاتے رہتے۔ گرجا کے اس تمام اجتماع میں اگر کوئی ذات تھی جو ایک سچے عیسائی کی طرح اس روحانی تقدس کو محسوس کرتی نظر آتی تھی تو وہ ایک بڑھیا کی ذات تھی جس کی کمر ضعف و ناتوانی سے قریب قریب دوہری ہو گئی تھی۔ بلاشبہ بڑھیا غریب تھی لیکن اس کے چہرہ میں ایک عجیب طرح کی بے فکری تھی، ایک خاص قسم کا استغنا تھا۔ اس کے سراپا میں ایک انوکھی کشش تھی اور وہ بہرِ رفتہ کے جاہ و جلال کے مٹنے والے کچھ نقوش اب بھی اپنے اندر رکھتی تھی، اس میں ایک ادا تھی، پُر وقار۔ ایک کشش تھی، جاذبِ نظر۔ اور ایک خودداری تھی، قابلِ پرستش۔ اس کا لباس اگرچہ معمولی تھا لیکن تھا صاف ستھرا۔ اس کے علاوہ گاؤں میں وہ ایک خاص عزت کی مستحق بھی سمجھی جاتی تھی کیونکہ گرجا میں اس کی نشست عام لوگوں کی صف کے بجائے، قربان گاہ کے نزدیک، سب سے الگ تھی۔ اس کے سراپا سے ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا میں اب اس کے لئے کوئی آرزو باقی نہیں ہے بجز ایک بہشت کی آرزو کے۔ جب میں نے اس کو طاعت و بندگی کے لئے کھڑے ہوتے، جھکتے اور کتاب مقدس کے صفحات کی ہر ہر سطر کو بغیر چھوئے بغیر دیکھے اس طرح پڑھتے دیکھا، گویا کہ وہ اس کو بالکل حفظ تھا۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس غریب بڑھیا کی آواز راہب کی دعا اور گرجا کے نغماتِ بندگی سے بہت پہلے بارگاہِ ایزدی میں پہونچ جاتی ہے۔

مجھے گاؤں کے گرجاؤں میں حاضر ہونے کا بہت شوق ہے اور یہ گرجا کچھ ایسی جگہ واقع ہوا تھا کہ اس نے اکثر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، گرجا ایک چٹان کی چوٹی پر واقع تھا جس کے دامن کو ایک مختصر ندی چھوتی ہوئی ایک سرسبز و شاداب وادی کی طرف چلی جاتی تھی۔ شاہ بلوط کے درخت جو گرجا کے ہم عمر نظر آتے تھے چاروں طرف سے اس کا احاطہ کئے تھے۔ اور گرجا کا بلند گنبد جو کہ فنِ تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ تھا، درختوں کے کنج سے آسمانی فضا کو چھوتا ہوا زاغ و زغن کے لئے ہوائی طواف کا کام دیتا تھا۔ ایک نورانی صبح میں وہاں بیٹھا ہوا دو مزدوروں کو جو ایک قبر کھودنے میں مشغول تھے، دیکھ رہا تھا۔ قبر کے لئے گرجا کے ایک دور افتادہ بیکار گوشہ کا انتخاب کیا گیا تھا جہاں لاتعداد قبروں کی موجودگی اس امر کا اظہار کر رہی تھی کہ محض لاوارث و غریب ہی اس جگہ سپردِ خاک کئے جاتے ہونگے

مجھے بتایا گیا کہ یہ نئی قبر ایک غریب بیوہ کے اکلوتے بیٹے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس حالت میں جبکہ میں اس دنیا میں فرقِ مراتب کے لغو امتیازات پر غور کر رہا تھا، جن کی حکومت نہ صرف حیاتِ دنیا بلکہ خاک کے اس آخری مرکز تک وسیع تھی، گرجا کے گھنٹے کی آواز نے کسی جنازہ کی آمد کا اعلان کیا۔ یہ تجہیز و تکفین غربت و ناداری کی تجہیز و تکفین تھی جس میں امارت کو قطعاً دخل نہ تھا۔ ایک سادہ تابوت کو جس پر کوئی چادر بھی نہ تھی چند دہقانی لئے ہوئے تھے۔ آگے آگے پادری انتہائی بے پروائی کے ساتھ جا رہا تھا۔ عام دستور کے مطابق نوحہ گروں کی بھی کوئی جماعت ساتھ نہ تھی، لیکن ایک حقیقی نوحہ گر، ایک سچا سوگوار ضرور موجود تھا جو جنازے کے پیچھے پیچھے تھا۔۔۔

یہ مرنے والے کی بڑھیا ماں تھی ـــــ وہی غریب بیوہ جس کو میں قربان گاہ کی سیڑھیوں پر بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ اس کی ایک غریب پڑوسن اس کو سہارا دئے ہوئے تھی اور اپنے طور پر صبر و شکر کی تلقین کر کر کے اس کی غمگساری کر رہی تھی۔ کچھ ہمسائے شریک جنازہ تھے اور ان کے بچے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ ساتھ تھے جو کبھی تو اپنے بے خبر جوش مسرت میں چیخنے لگتے تھے، اور کبھی رک رک کر ایک انداز معصومانہ کے ساتھ نوحہ گر کے حزن و ملال کو بغور دیکھنے لگتے تھے، جونہی جنازہ قبر کے نزدیک پہونچا گرجا کا راہب اپنے مخصوص لباس سے آراستہ ہو کر، دعا کی کتاب ہاتھ میں لے، گرجا سے نکلا۔ رسم دعا کی ادائی کے لئے کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا تھا۔ کیونکہ مرنے والا خود صاحب مقدرت نہ تھا اور اس کے پس ماندہ یکسر مفلس و نادار، اس لئے رسمی طور پر دعا ضرور کی گئی لیکن نہایت بے پروائی سے، رحیم و کریم راہب گرجا کے دروازہ سے صرف چند قدم ہی آگے بڑھا تھا۔ اس کی آواز مشکل ہی سے قبر تک پہونچتی تھی، اور اس کا اس دعائے آخری کی رسم کو ادا کرنا جس سے زیادہ اثر انگیز اور دل دوز رسم شاید ہی کوئی اور ہو ـــــ یہ معلوم ہوتا تھا کہ چند نہایت ہی سرد و بے اثر الفاظ کو دعا کے طور پر پڑھ دیا گیا ہے۔ میں نے کبھی دعائے آخری کو اس درجہ سرد و بے اثر محسوس نہیں کیا۔

میں قبر کے نزدیک پہونچا۔ تابوت زمین پر رکھ دیا گیا۔ اس پر مرحوم کا نام اور اس کی عمر کندہ تھی ـــــ

"جارج سامرز نام عمر ۲۶ سال ـــــ"

غریب ماں کسی کا سہارا لیکر تابوت کی طرف جھکی۔ اس کے مضمحل ہاتھ ایک دوسرے سے ملے جیسے کہ وہ دعا کرنے کو ہو، لیکن اس کے جسم سے ہلکے سے ارتعاش اور اس کے لبوں کی جنبش سے میں نے اندازہ کر لیا کہ وہ ان تمام جذبات شفقت و محبت کو جو اس دنیا میں صرف ایک ماں ہی کا حصہ ہو سکتے ہیں، لئے ہوئے اسوقت اپنے لخت جگر کے آخری دیدار میں مصروف تھی

تابوت کو سپرد خاک کرنے کے لئے تمام سامان طیار ہو چکے ہیں اور اب اس آخری طیاری کی وہ اوسان خطا کر دینے والی آواز جو جذبات محبت و غم کے لئے حد درجہ صبر آزما ہوتی ہے، پیدا ہوئی۔ ہدایات کا وہ سلسلہ جو خشک و دل سوز کاروباری انداز میں ادا کیا جاتا ہے، شروع ہوا۔ آہ! ایسے موقعوں پر کھدال و پھاوڑہ کا قبر کی ریگ اور پتھر سے رگڑ رگڑ کر مختلف آوازیں پیدا کرنا دنیا میں سب سے زیادہ دل دوز منظر ہوتا ہے۔ اور پھر ان آوازوں کا ایک ایسی قبر سے پیدا ہونا جس میں سونے والا ہمارا عزیز ترین محبوب، ہمارا قریب ترین عزیز ہو، اور بھی روح فرسا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ دردانگیز منظر شاید ہی کوئی اور ہو۔

چاروں طرف کے شور و ہنگامہ سے بڑھیا اس طرح چونکی گویا کہ وہ کوئی نہایت ہی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی نیم بیدار آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کچھ وحشیانہ انداز میں اپنے گرد و پیش جائزہ لیا۔ اور

ادھر لوگوں نے تابوت قبر میں اتارنا شروع کیا، اُدھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ ملے اور رنج سے بے قابو ہو کر فرشِ زمین پر گر گئی۔ اُس کی پڑوسن نے جو اس کی تنہا ہمدرد و غمگسار تھی سہارا دیکر اس کو زمین سے اُٹھایا اور کچھ تسکین آمیز الفاظ کہے :۔ "نا بہن، نا! اپنے تئیں کیوں مارے ڈالتی ہے" لیکن جواب میں اس نے صرف سر ہلا دیا اور ہاتھ ملتی رہی گویا کہ تسکین غم اب اُس کی قسمت میں تھا ہی نہیں۔ لوگ تابوت قبر میں اتار رہے تھے اور اُن کے اس عمل سے جو حرکت پیدا ہوتی تھی وہ اُس کے اضطراب اور بے چینی میں ایک اور دہشتناک اضافہ کا باعث تھی۔ یہی نہیں بلکہ جب کسی اتفاقی حادثہ کے باعث تابوت کو کوئی صدمہ پہونچتا تو اسکے مادرانہ جذبات کو ایک ٹھیس سی لگتی، وہ فرطِ غم سے تڑپنے لگتی اور ایک ایسا کرب محسوس کرتی گویا کہ اس کے بچے کو جو اب تمام دنیوی رنج و غم کی دستبرد سے بلند ہو چکا تھا، واقعی ضرب پہونچنے کا اندیشہ تھا۔ میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اور میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہاں کھڑا ہونے اور مادرانہ شفقت کے اس درد انگیز منظر کو دیکھنے میں اپنی انتہائی بربریت کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔ میں گرجا کے ایک دوسرے گوشہ میں چلا گیا اور وہیں رہا اُس وقت تک کہ اہلِ جنازہ کی یہ جماعت یہاں سے رخصت نہ ہو گئی۔

میں نے جب ماں کو انتہائی حزن و ملال کے عالم میں آہستہ آہستہ قبر سے رخصت ہوتے اور اُس شخص کے تمام آثار کو جو دنیا میں اس کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھا پیچھے چھوڑتا ہوا دیکھا تو میرا دل اس کے لئے تڑپنے لگا۔

مجھے خیال آیا کہ دولتمندوں کے لئے تکلیف و ایذا اور مصیبت و غم کیا معنی رکھتے ہیں جبکہ اُنکو تسکین غم کے لئے احباب و اعزہ کا ایک حلقہ اور سکون اضطراب کے لئے ہر قسم کا سامانِ عیش و مسرت میسر ہے، وہ اگر دل بہلانا چاہیں تو ایک دنیا حاضر اور غم غلط کرنا چاہیں تو ایک جہان موجود۔ نوجوانوں کے لئے سوگ و ماتم کا کیا مفہوم ہے جبکہ اُن کی نوخیزی عمر ہر زخم کے درد کو ان کے دل سے محو کر دیتی ہے، اُن کی روحانی لچک ہر غم تازہ کی یاد اُن کے دل سے بھلا دیتی ہے اور جبکہ ان کا روحانی تلطف بہت جلد اپنے لئے ایک نیا مرکزِ لطف تلاش کر لیتا ہے۔ لیکن ایک غریب کے رنج و ماتم کو دیکھو جس کے پاس تسکینِ غم کے لئے کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ ایک بڑھیا کے رنج و غم پر نظر ڈالو جس کے نزدیک زندگی کا مفہوم ایک سرد و خشک دن سے زیادہ نہ ہو، اور جو اپنے لئے کسی آیندہ امید کی توقع نہ رکھتی ہو۔ ہاں! ایک بیکس بیوہ کے غم و اندوہ پر اپنا دل دکھاؤ، جو اپنے اکلوتے بیٹے کی قبر پر ——— جس کے دم سے اس کی زندگی کی ساری اُمیدیں وابستہ تھیں، جو اسکی زندگی کا آخری سہارا، آخری تسکین اور آخری اُمید تھا ——— آنسوؤں کی آخری نذر چڑھا رہی ہو۔ حقیقت یہ ہے

کہ اسی قسم کے سوگ کو دیکھ کر ہمیں صبر و تسکین کی بے چارگی کا قایل ہونا پڑتا ہے۔

گرجا سے واپس ہونے کے کچھ دیر بعد مجھے وہ عورت ملی جو اس غریب بیوہ کی پڑوسن اور تنہا غمگسار تھی۔ میں نے اس دل دوز واقعہ کے متعلق کچھ مزید تفصیلات اس سے حاصل کیں۔

مرنے والے کے والدین ایک زمانۂ نامعلوم سے اس گاؤں میں آباد تھے۔ ایک صاف ستھرے مکان میں رہتے اور کچھ مزدوری اور کچھ باغ کی آمدنی سے اپنی گزر کر لیا کرتے تھے۔ اُن کی زندگی بے فکری سے گزرتی تھی گاؤں میں انھوں نے کبھی کسی کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اُن کے ایک بیٹا تھا جو جوان تھا اور اُن کے بڑھاپے کا تنہا سہارا۔

"ہاں صاحب" اُس خاتون نے کہا: "میں بیان نہیں کر سکتی مرحوم کن خوبیوں کا آدمی تھا۔ وہ اُس کا حسن و شباب، وہ اس کے اخلاق و عادات، اور وہ اس کی سعادت مندی اور اطاعت گزاری ـــــ حقیقت یہ ہے کہ وہ اخلاق و شرافت کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھا۔ اتوار کے دن خصوصیت سے اس کو دیکھ لینا مزید مسرت کا باعث ہوتا تھا جبکہ وہ اپنا بہترین لباس زیب تن کئے، تندرست و توانا، خوش و خرم، ایک انداز خاص کے ساتھ اپنی بڑھیا ماں کو گرجا پہونچانے جاتا۔ اُس کی بڑھیا ماں بھی اس پر فخر کرتی تھی کیونکہ پورے گاؤں میں شاید ہی کوئی لڑکا ایسا سعادتمند اور ان خوبیوں کا حامل موجود ہو۔

بدقسمتی سے ایک سال نہایت سخت قحط پڑا اور ضعیف والدین کے اس اکلوتے بیٹے کو بھی گاؤں چھوڑنا پڑا اُس نے ایک کارخانے میں جو قریب ہی ایک دریا پر واقع تھا، ملازمت اختیار کر لی۔ اس نئی ملازمت کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ ایک جبریہ بھرتی کرنے والی جماعت کے جال میں پھنس گیا اور اس طرح بحری فوج میں داخل ہو گیا۔ والدین کو اس کی اچانک گرفتاری کی خبر تو پہونچی لیکن اس کے بعد کوئی اطلاع نہیں ملی اور اس طرح یہ غریب والدین اپنے اس آخری سہارے سے بھی محروم ہو گئے۔ اُس کا باپ ہمیشہ کا ضعیف و ناتواں تھا اس صدمہ نے اس کا دل توڑ دیا۔ وہ کچھ دیوانہ سا ہو گیا اور آخر آغوش لحد میں جا سویا۔ بیوہ اب لاوارث و تنہا رہ گئی تھی یہاں تک مجبوری بڑھی کہ روٹیوں سے محتاج ہو گئی اور آخر کار اس کو گرجا کے خیراتی ٹکڑوں کا سہارا لینا پڑا۔ گاؤں کے لوگوں کی ہمدردی اب بھی اس کو حاصل تھی۔ اب بھی اس کو گاؤں کا ایک قدیم باشندہ ہونے کی حیثیت سے خاص عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ اس کا قیام ابھی اپنے قدیم مکان ہی میں تھا جہاں وہ اپنی خاموش زندگی گزار رہی تھی اُس کی محدود ضروریات زندگی کے لئے باغیچہ کی مختصر پیداوار ـــــ جہاں گاؤں کے نیک باشندے کبھی کبھی بطور ہمدردی اُس کی خاطر کاشت کر دیا کرتے تھے ـــــ کافی ہوتی تھی۔"

اس واقعہ کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ بلکہ اس کے کچھ ہی دن پہلے کہ مجھے اس افسانے کی تفصیلات حاصل ہوئیں، سنا گیا ہے کہ بڑھیا ایک روز اپنے باغیچہ میں کچھ ترکاری چُن رہی تھی کہ یکایک مکان کا دروازہ کھلا۔ اور ایک اجنبی سامنے سے آیا۔ وہ گرد و پیش پر نہایت وحشتناک انداز میں متجسسانہ نظریں ڈالنے لگا۔ وہ جہازیوں کے لباس میں تھا۔ دبلا پتلا۔ چھریرے بدن کا آدمی، چہرہ پر مُردنی چھائی ہوئی — دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بیمار ہے اور مصیبت کا مارا ہوا ہے۔ غرض اس زندہ کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ اس نے بڑھیا کو دیکھا۔ اس کی طرف بڑھا اس کے قدم مشکل سے اُٹھتے تھے اور اُٹھتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ بڑھیا کے قدموں پر جھک گیا اور بچوں کی طرح آنسو بہانے لگا۔ بڑھیا حیران تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میری پیاری ماں! کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں، کیا تم اپنے لڑکے، اپنے بدبخت لڑکے جارج کو بھول گئیں"۔

ہاں! اسی بدبخت لڑکے کی یہ "زندہ لاش" تھی، اُسی کم نصیب کے یہ شکستہ آثار تھے جو کبھی اُسکی آنکھوں کا تارہ، شکستہ اُمیدوں کا سہارا تھا اور جس نے اب پھر دنیا میں ٹھوکریں کھا کر، قید و بند کی مصیبت کاٹ کر، زخموں سے چور، درد سے رنجور، گھر کا رخ کیا تھا تاکہ اپنی شکستہ روح کو پھر اُسی گھر کے متعارف ماحول میں سودہ کر سکے۔

میں اس اچانک ملاقات، اس درد انگیز واپسی کی تمام تفصیلات کو جس میں حسرت و یاس اور مسرت و انبساط کا ایک عجیب و غریب امتزاج مہیا تھا بیان نہیں کروں گا۔ وہ ابھی زندہ و حیات تھا۔ گھر واپس پہونچ چکا تھا۔ اُس کے زندہ رہنے اور اپنی ماں کا آخری سہارا ہونے کی امیدیں بھی ابھی باقی تھیں۔ بظاہر سب کچھ تھا۔ لیکن دوسری طرف قدرت اپنا سب کام ختم کر چکی تھی اور اگر کوئی کمی اس کی قسمت کا لکھا پورا ہونے میں باقی تھی تو اس کو اُس کے آبائی مکان کی ویرانی نے پورا کر دیا۔ وہ اپنی ماں کے بستر پر جس پر اُس نے نہ معلوم کتنی بے چین راتیں آنکھوں میں گزاری تھیں، لیٹ گیا، اور پھر کبھی اس کو اس بستر سے اُٹھنا نصیب نہیں ہوا۔

گاؤں میں جب جارج سامر کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو دنیا اس کو دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ ان میں سے ہر شخص نے جہاں تک اُن کی ناداری اجازت دے سکتی تھی، امداد و اعانت سے دریغ نہیں کیا۔ اضمحلال و کمزوری نے یہاں تک مجبور کر دیا تھا کہ وہ زبان سے لوگوں کا شکریہ تک ادا نہ کر سکا لیکن اس کا چہرہ اُس کے اظہار تشکر کا گواہ تھا۔ ماں اُس کی تنہا تیماردار ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتی تھی کیونکہ کسی دوسرے ہاتھ کی مدد اس کو منظور نہ تھی۔

دکھ درد اور بیماری میں خدا جانے وہ کونسی قوت ہے جو سخت سے سخت انسان کے جوش و ہمت کیلئے پیام موت بن جاتی ہے۔ جو سخت سے سخت دل کو موم اور سنگدل سے سنگدل انسان کو پانی کر دیتی ہے۔

یہ اُسی قوتِ پنہاں کا کرشمہ ہے کہ ایک سنگدل انسان کو بھی شیر خوار بچہ سے زیادہ معصوم بنا دیتی ہے۔ ایک ایسے انسان کی بیماری کا تصور کرو جو جوانی میں بچپن سے زیادہ کمزور تھا۔ جو غریب الوطنی میں بستر علالت پر پڑا ایڑیاں رگڑ چکا تھا۔ اس حال میں کہ نہ کوئی غمگسار پاس تھا، نہ تیمار دار، جو اکثر اس عالم میں ماں کا تصور کر لیتا تھا اُس ماں کا جو عالم طفولیت میں اس کی نگراں تھی، آسایش کی ذمہ دار تھی: اور اب اس بیماری اور عالم بے چارگی میں اسکی تیمار داری اور غمگساری کر رہی تھی۔

آہ محبت! وہ محبت جو ایک ماں کو بیٹے سے ہوتی ہے یقیناً اپنے اندر ایک روحانی شفقت، ایک ملکوتی نرمی رکھتی ہے۔ اور تمام محبتوں پر اگر سبقت ہے تو اسی کو اور اگر سب پر حاوی ہے تو یہی۔ بیٹے کی خود غرضیاں اس آگ کو سرد نہیں کر سکتیں۔ دنیا بھر کے خطرے، اس رشتہ میں تذبذب پیدا نہیں کر سکتے۔ بیٹے کی نااہلیتیں اس گرمیٔ محبت کو کم نہیں کر سکتیں اور اُس کی احسان فراموشیاں اس رشتہ و تعلق میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتیں۔ ماں بیٹے کی خاطر اپنے آرام کو قربان کر سکتی ہے۔ وہ اُس کے لئے اپنے تئیں دنیا کے عیش سے محروم کر سکتی ہے۔ وہ بیٹے کے آرام و تفریح کے لئے اپنے اوپر ہر شے حرام کر سکتی ہے۔ بیٹے کی ترقی و بہبودی اسکی جان ہے اور اس کی شہرت و خوشحالی ماں کا ایمان۔ وہ قسمت کے ہر نشیب و فراز میں اُس کی شریک ہے۔ اگر بدحالی اس کی قسمت میں لکھی ہے تو ماں کی نظر میں وہ اور زیادہ مستحق محبت ہے۔ اور اگر دنیا کی نظر میں وہ محض ذلت و رسوائی کا مستحق رہ گیا ہے تو ماں کے لئے اُس کی یہ ذلت و رسوائی ہی مزید محبت کا سبب بن جائے گی۔ اور اگر تمام دنیا اس کو اپنی نظروں سے گرا دے تو اب یہ ماں ہی اس کے لئے "تمام دنیا" ہو جائے گی۔ غرض مادرانہ محبت ہر حال میں اس کی شریک ہے۔ اگر بیٹے کی ترقی و بلندی اس کے لئے باعث فخر و مسرت ہے تو اُس کی ذلت و رسوائی موجب لطف و محبت۔

جارج سامر اس تلخ حقیقت کو محسوس کرتا تھا کہ پردیس میں کسی کا بیمار پڑنا اور تیمار دار کا پاس نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ اس چیز سے آشنا تھا کہ قید و بند میں زندگی گزارنا اور وہاں کسی یار و غمگسار کا آکر نہ پوچھنا کیا مفہوم رکھتا ہے۔ چنانچہ اب کہ وہ بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا مشکل ہی سے کسی وقت ماں کو اپنی نظروں سے غائب ہونے دیتا تھا وہ اگر کسی کام سے اُٹھکر جاتی تو اس کی نظریں اس کا تعاقب کرتیں۔ بڑھیا گھنٹوں اس کے سرہانے بیٹھی اس کی صورت دیکھا کرتی جبکہ وہ سوتا ہوتا تھا۔ اکثر اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی، وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا، ماں کی تلاش میں نظریں دوڑاتا اُس وقت تک کہ وہ اس کو اپنے سرہانے جھکی ہوئی نظر نہ آجاتی۔ وہ ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا، سینہ پر رکھتا اور پھر اس سکون کے ساتھ جو ایک شیر خوار کو آغوشِ مادر میں حاصل ہوتا ہے، سو جاتا۔ اس طرح اُس نے جان دی تھی۔

یہ دل ہلا دینے والا افسانہ سنکر پہلا خیال جو مجھے پیدا ہوا یہ تھا کہ میں اس بیوہ کو جاکر دیکھوں اور کچھ مالی امداد پیش کروں اور اگر ممکن ہو تو اس کے لئے کچھ آیندہ سہولتیں بہم پہونچاؤں۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ گاؤں کے دیندار لوگوں نے ہر ممکن انتظام اس کے لئے کر دیا تھا میں نے بھی اس اُصول کی پابندی کرتے ہوئے کہ — غربا آپس میں ایک دوسرے کے دکھ درد کا علاج بہتر جانتے ہیں — اُن کے معاملات میں دخل دینے کی جرأت نہیں کی۔

دوسرے اتوار کو گرجا میں، میں نے بڑھیا کو اپنی مقررہ نشست گاہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے بھی اپنے بیٹے کے ماتم میں رسمی سوگ کے اظہار کی کوشش کی تھی۔ جیسا کہ اس کے ماتمی لباس سے ظاہر ہوتا تھا۔ مادرانہ شفقت اور مفلسانہ مجبوری کی کشمکش کا یہ منظر بھی نہایت ہی رقت انگیز تھا۔

ایک سیاہ معمولی غیتہ، ایک ہلکے رنگ کا سیاہ رومال اور اسی قسم کی اور دوسری چیزیں — یہ تھا اس کا کل ماتمی لباس جس کے ذریعہ اُس نے سوگ و ماتم کی مقررہ رسم کو ادا کرنا چاہا تھا۔

میں نے جب اپنے چاروں طرف کی دو منزلہ عمارتوں، شاہانہ گنبدوں، اور مرمریں یادگاروں کو دیکھا جو زبان حال سے اپنے گزشتہ جاہ و جلال کا ماتم کر رہی تھیں — اور پھر میری نظر اس غریب بیوہ کے غم واندوہ پر پڑی جس کو غموں نے چور کر دیا تھا — اور جو باوجود ان تمام روحانی ایذاؤں کے اپنے خدا کے حضور میں حاضر ہونے سے غافل نہ تھی، تو میں نے محسوس کیا کہ ان قدیم یادگاروں کے سوگ و ماتم سے اس حقیقی یادگار کا رنج و ملال کہیں زیادہ افضل تھا۔

میں نے اس بیوہ کی درد بھری کہانی گاؤں کے کچھ متمول اور پرہیزگار لوگوں کو سُنائی جو اس سے کافی متاثر ہوئے، چنانچہ بڑھیا کو آرام و سہولتیں پہونچانے کی ہر ممکن کوشش اُن کی طرف سے کی گئی، لیکن اب کہ وہ خود آغوشِ لحد سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی، یہ کوششیں بیکار تھیں۔

اس واقعہ کو دو ہفتے بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ گرجا کی وہ نشست جو بڑھیا کے لئے مخصوص تھی خالی نظر آنے لگی، اور مجھے وہاں سے واپس ہونے کے قبل یہ اطلاع ملی، جو میرے لئے ایک حد تک اطمینان کا باعث تھی، کہ بڑھیا نے نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ اپنی آخری سانس پوری کر دی اور اپنے پیاروں میں شریک ہونے کے لئے اُس دنیا کا سفر اختیار کر لیا جہاں دوست کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور جہاں غم و الم کو کوئی نہیں جانتا۔

(واشنگٹن ارونگ)

عبدالقدیر خاں۔ میرٹھ کالج۔ میرٹھ

ازدواج

چھوٹے چھوٹے تاریک مکانوں میں روتے، بلبلاتے اور بسورتے بچے پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے چہرے پر گرد و غبار ہے۔ اور اُن کی آنکھوں کے حلقے پڑے ہیں۔ میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے اُن کے نحیف گلوں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے پر اُن کی نظر ہے۔ بازار میں ہر میوہ کو دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ خلد میں وہ دوسروں کا کام کرتے ہیں۔ گھر میں گھر والوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اُستاد اُن پر غراتا ہے۔ اعزا اُنھیں نالائق بتاتے ہیں۔ دن بھر یونہیں اندر باہر دوڑتے گزرتا ہے۔ رات کو ایک کثیف آب و ہوا والے مکان کی کوٹھری میں حشرات الارض کی طرح پڑے خراٹے لیتے رہتے ہیں۔ ماں باپ دن بھر اپنی فکروں میں مبتلا، دنیا اُن کی نظروں میں اندھیر۔ زمین سے آسمان تک ساری فضا تاریک۔ خون پسینہ کرکے دن گزرا۔ اور آہیں بھر کر رات کاٹی صبح اُٹھے تو پھر کولھو کا بیل جہاں تھا وہیں ہے.....

یہ ہیں ہماری ننانوے فیصدی ازدواجی زندگیاں!

پھر میں مانتا ہوں کہ ازدواج فطری ہے۔ اور یہ بھی مانتا ہوں کہ ازدواج کا فطری نتیجہ اولاد ہے۔ لیکن جب ہماری ساری زندگی ہی فطرت کے خلاف ایک مستقل بغاوت ہے۔ ایک ان تھک جنگ ہے اور ایک مسلسل جہاد ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس مسئلہ میں بھی "فطرت" کو اپنی "ضرورت" کے مطابق نہ بنالیں۔

جب پہاڑوں کے غاروں کو انسانی "ضرورتوں" نے "چہار دیواریوں" میں تبدیل کردیا۔ فطرت کی کھلی نعمتیں بازاروں میں بکنے لگیں۔ امیر و غریب، بادشاہ و وزیر اور مزدور و سرمایہ دار کا امتیاز پیدا ہوگیا —— یہ سب "ضرورت" کے ماتحت، تو پھر کیوں نہ ہمارے ازدواج بھی ضرورت کے آہنی شکنجہ میں کسے جائیں؟

اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ ازدواج کی واحد غرض بقائے نسل ہے۔ اور اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ کمزور و ناتواں اور ضعیف و نزار لوگوں کو فطری اعتبار سے کونسا حق پہونچتا ہے کہ وہ اپنے جیسے بلکہ اپنے سے بھی برتر نفوس کو دنیا میں لاکر سوسائٹی کے کندھوں پر اُن کو مستقل بوجھ بنادیں؟

آپ کہیں گے کہ ماشاء اللہ! یہ کیا نیا فلسفہ!! کیا ہم کمزور ہیں تو شادی سے بھی گئے گزرے ہوئے؟

دنیا کی یہ راحت بھی ہم سے چھین گئی ؟

میں پوچھتا ہوں، آخر آپ کے ازدواج کا مقصد ؟ بقائے نسل تو آپ سے ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جو کچھ آپ لائیں گے اُن کو اگر موت نے چھوڑ بھی دیا تو وہ جہد للحیات کی نذر ہو جائیں گے۔ اگر آپ کی رگوں میں خون کے بجائے پانی دوڑ رہا ہے تو اُن کی رگوں میں سیسہ دوڑے گا۔ آپ میں سیمابیت نہیں، حرکت و حیات نہیں جوش و اُمنگ نہیں۔ اور پھر بقائے نسل کا دعویٰ !

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست !!

ہاں، آپ کا ایک حربہ اور ہے۔ جذبات رویہ کا سکون ؟ لیکن کیوں نہ آپ اس کی اصلاح کریں ؟ جس طرح آپ نفس کی بیجا خواہشوں کے باوجود اور سیکڑوں معصیتوں سے مجتنب رہتے ہیں اسی طرح اس سے بھی کنارہ کش رہیں ؟ لیکن اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو پھر آخر "قوتِ ملکی" کا مقصد ؟

شاید آپ مجھے قنوطیت پسند کہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ازدواج عام انسانوں کے حق میں سم قاتل ہے۔ آپ مجھے ملامت کریں گے۔ کیجئے۔ لیکن چند منٹ میری گزارشوں پر غور کر لیجئے۔

اگر سرسری طور پر سوسائٹی کے افراد کی تقسیم کی جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اُس میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ امیر و غریب۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امرا کے لئے ازدواج ہر صورت میں رحمت ہونا چاہئے۔ لیکن واقعہ اسکے خلاف ہے۔ دنیا میں انسان کی گرانمایہ ترین نعمت اُس کی قوتِ مفکرہ ہے۔ لیکن ازدواج کے بعد آدمی کی تمامتر توجہات "خانہ داری" میں کچھ اس طرح گم ہو جاتی ہیں کہ اُس کو سوچنے کا موقعہ بہت کم ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اُس کے قوائے عقلیہ ماند پڑتے جاتے ہیں۔ ذہنی طاقتیں شل ہوتی جاتی ہیں۔ اور وہ ہر کام میں ... اپنی انفرادیت کو کھو کر صرف جماعت کے رسمی قوانین کی کورانہ تقلید کرنے لگتا ہے۔ نہ اُس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے فیصلوں پر غور کرے۔ اور نہ اُس کی خود پیدا کردہ "مادی دلچسپیاں" اُس کو اس قسم کے ٹھوس مسائل پر فکر کرنے دیتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اُس کی حالت گلہ کی اُس بھیڑ کے مانند ہو جاتی ہے جو بلا سوچے سمجھے سارے گلہ کے ساتھ ساتھ کان دبائے چلی جاتی ہے۔ خود اُس کو اپنی ذات پر کوئی اعتماد نہیں ہوتا۔

انسان کی فطرت بہت بلند ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اُس کے سامنے سرنگوں ہو سکتی ہے۔ کل کائنات بھی اُس کی طاقتوں کے مظاہرے کے لئے ناکافی ہے۔ لیکن یہ اُسی وقت جب اُس کے قوائی عقلیہ

آزاد ہوں۔ اور اپنی پوری قوت کے ساتھ مصروفِ عمل۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ دنیا میں حقیر ترین چڑیا سے بھی زیادہ پست و ذلیل ہے جو دن بھر درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر گاتی ہے اور رات کسی گھنے درخت کے پتوں میں چھپ کر گزار دیتی ہے۔

قوت مفکرہ کے ضعف کے بعد آپ کے عزائم اور حوصلوں کی پستی یقینی ہے۔ اس لئے کہ معاشی کشاکش سے جو وقت بچے گا وہ خانگی مصروفیتوں میں صرف ہوگا۔ "رنگینیوں" میں صرف ہوگا، "نمایش و سجود" میں صرف ہوگا۔ اُسوقت آپ کی نظروں میں دنیا کی مسرتوں کے تمام دروازے آپ پر کھلے ہوں گے اور آپ گلابی فضا میں اپنی روح کو تحلیل کر رہے ہوں گے.....

پھر اگر حوصلہ ہوگا بھی تو طلب زر کا تاکہ جسمانی آسائشوں کے زیادہ سے زیادہ سامان فراہم ہو سکیں۔ گھر کا فرنیچر اپنے ہمچشموں کے مقابلہ میں بہتر ہو۔ کپڑے زیادہ قیمتی ہوں۔ موٹر کا ماڈل ہر سال نیا ہو، اعزہ و اقربا کی نظروں میں دھاک بیٹھی ہو ـــــ اور یہی وہ چیز ہے جس کے بعد انسان تنگ نظری اور دوں ہمتی کا شکار ہو کر روز بروز پست سے پست تر ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ گو اُس کے بدن پر سلک و سرج کا سوٹ ہو لیکن اُس کی روح کائنات کی کثیف ترین چیز ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایک پیسہ کو سینت کر رکھتا ہے۔ خود غرضی اُسکی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے ایثار کی بے لوث اسپرٹ اُس سے چھن جاتی ہے۔ بظاہر وہ بہت خلیق نظر آتا ہے لیکن حقیقتہً وہ دوسروں سے قطعاً بے پرواہ ہوتا ہے۔ اعزہ اور احباب اُس کے نزدیک کسی نوعیت سے قابل اعتنا نہیں ہوتے۔ اس کی ساری زندگی خود غرضی و فریب کا ایک دام ہوتی ہے ـ ایک خوفناک دام!

ازدواج کے بعد انسانی تعلقات کچھ اس قسم کے ہو جاتے ہیں کہ آدمی کو اپنے گرد میں تصنع سے کام لینا پڑتا ہے۔ اُس کو بتلانا ہوتا ہے کہ وہ بیوی کے خاندان کے ہر فرد کے ساتھ اُتنا ہی خلوص رکھتا ہے جتنا اُسے اپنے خاندان کے افراد سے ہے۔ اُسے تمام رسمی مواقع پر اُن کی آؤ بھگت کرنا ہوتی ہے۔ اُن کے ابرو کی خفیف سے خفیف شکن کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ اُنھیں کسی صورت سے شکایت کا موقع نہ ملے اس کا نتیجہ ہوتا ہے ریا، فریب اور ظاہر داری۔

سالے کے بچے کے ختنہ ہیں۔ آپ کا اُس کے لئے جوڑا بنوانا ضروری۔ اُس کے یہاں مبارک باد کیلئے جانا لازمی۔ ورنہ آپ کا گھر ایک مستقل عذاب!

آپ کہیں چلے جاتے ہیں اور اپنے دوست سے نہیں ملتے۔ اُس کو خط بھی نہیں بھیجتے۔ واپسی پر وہ آپ سے اس کی وجہ پوچھتا ہے۔ آپ کہہ دیتے ہیں "بھول گیا تھا"۔ یا۔ "غیر ضروری سمجھا"۔ دیکھئے، چونکہ آپ کو

اُس کی ناراضی یا رضامندی سے کوئی خوف یا لالچ وابستہ نہیں ہے۔ اس لئے آپ کے الفاظ میں صداقت ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے خسر سے ایسا کہدیں تو دنیا میں جینا حرام ہو جائے۔

شاید حافظ نے انھیں باتوں کو دیکھ کر کہا ہوگا:۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

لیکن ازدواج کے یہ تمام تاریک پہلو کسی حد تک قابل برداشت ہو سکتے ہیں اگر آدمی فارغ البال ہو اور زندگی کی ضروری آسانیاں اُسے حاصل ہوں۔ مگر دنیا کی عام آبادی کی بحث کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر اسوقت صرف ہندوستان پر نظر رکھی جائے تو ماننا پڑے گا کہ ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے نفوس بھی ایسے نہیں ہیں جو اس شرط کو پورا کرتے ہوں۔ وہ خون پسینہ ایک کرنے کے بعد بھی زندگی کی وہ سہولتیں فراہم نہیں کر سکتے جو بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں ــــ اُن کا گھر ایک جھونپڑی ہوتا ہے۔ اُن کا بستر ایک پھٹی ہوئی دری۔ اور اُن کا تکیہ صرف خدا ــــ یہ وہ لوگ ہیں جو دن بھر تپھر چھوڑتے ہیں۔ اور شام کو پیٹ سے تپھر باندھ کر سو جاتے ہیں۔ جن کے خون نے دوڑنا چھوڑ دیا ہے اور جن کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو چکے ہیں۔ جن کو کانگریس صرف "والنٹیر" بناتی ہے۔ اور گورنمنٹ سپاہی یا چوکیدار ــــ یہی وہ طبقہ ہے جس کے لئے ازدواج ایک موت ہے۔ ذلت و گمنامی کی موت!!

پھر اُن تمام باتوں کے علاوہ جو اوپر بیان کی گئیں ان کا ازدواج اُن چند لقموں کو بھی ان کے منہ سے چھین لیتا ہے جن کو کھا کر یہ چین سے سو جاتے تھے۔ کملائے ہوئے اور پتلے دُبلے۔ بچے جن کو نہ تھرا لباس نصیب ہے اور نہ شام کی تفریح اُن کے لئے ہر وقت سوہان روح بنے رہتے ہیں۔ مسرت اُن کے چہروں سے مفقود ہوتی ہے۔ اُن کے ہر ہر بُن مو سے حسرت و یاس کے چشمے اُبلتے ہیں۔ بیوی اور بچے سب کے چہرے حزن و ملال کی ایک مستقل داستان ہوتے ہیں۔ تندرستی کے تمام وسائل معدوم ہوتے ہیں۔ نہ اُن کو وٹامن اے ملتا ہے نہ وٹامن بی۔ چھوٹے بڑے سب سیکڑوں آلام کا شکار ہوتے ہیں مگر شکایت کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ مبادا اُن کی یہ شکایت لوگوں کو اور زیادہ اُن سے متنفر نہ بنا دے۔

ان تمام حالات کے ماتحت دھیرے دھیرے اُن کے اخلاق میں گھن لگتا جاتا ہے۔ اُن کی طبیعت سے غنا، سیر چشمی، بلند نظری اور عالی حوصلگی کے جذبات فنا ہوتے جاتے ہیں۔ حُسنِ معاشرت کے تمام چشمے ایک ایک کر کے خشک ہو جاتے ہیں۔ گھر بے اطمینانی و بے سکونی کا ایک مستقل مرکز بن جاتا ہے۔ جس میں کبھی شوہر و زوجہ

باہم دست وگریباں نظر آتے ہیں اور کبھی شوہر و زوجہ ایک طرف اور کنبہ کے اور اعزا دوسری طرف،

غریب شوہر دنیا بھر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا گھر آیا۔ اُس کا پیٹ خالی ہے۔ اُس کے ہونٹ خشک ہیں۔ اور اُس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک چکا ہے ـــ اتفاق سے کھانے میں نمک تیز ہے اُس کا خون اونٹنے لگتا ہے۔ وہ بیوی سے کہتا ہے:ـ

"یہ آج تم نے کھانے میں نمک کتنا ڈال دیا تم ہر وقت ایسا ہی کرتی ہو"

جملہ بظاہر کچھ زیادہ سخت نہیں ہے۔ لیکن زندگی کی سختی و نرمی تو آپ کی قلبی کیفیت پر منحصر ہے ـــ بیوی خود بچوں کی یاس انگیز نظروں۔ آئے دن کے جھگڑوں اور گھر کی کس مپرسانہ حالت سے سر سے پیر تک ایک کراہ بن چکی ہے۔ چنانچہ اُس کے جواب میں بھی کسی حد تک تلخی ہوتی ہے ـــ نتیجہ سوءِ معاشرت!

بچے اسی فضا میں پرورش پاتے ہیں۔ ماں باپ کا اخلاق فطرتاً اُن میں جگہ پکڑتا جاتا ہے۔ والدین اُنکی تربیت سے معذور۔ بچے اس فضا کا اثر قبول کرنے پر مجبور۔ بالآخر یہی بچے جب ہوش و خرد کو پہونچتے ہیں تو اُن کے جسم سوکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں دھنسی ہوئی۔ اُن کے دماغ کمزور۔ اُن کے حوصلے پست، اُن کے مزاج چڑچڑے اور اُن کے اخلاق قابل نفرت۔

ضعفِ صحت اُن کے تمام شجاعانہ جذبات کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ دنیا کو مکر و فریب کا ایک طلسم پاتے ہیں۔ وہ نامعلوم طور پر دنیا اور دنیا والوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اور اپنے اغراض کی تکمیل کے لئے دوسروں کی ہڈیوں کا پُل بنانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اُن کو اپنے بازوؤں پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اپنی حقیقی طاقتوں کو بھول چکے ہوتے ہیں۔ وہ لونڈیوں اور غلاموں کی ایک جماعت ہوتی ہے جن کے خون سے "سرمایہ" کھیلتا ہے۔ اور وہ خود اپنے خون سے۔

یہ ہیں وہ بچے جو ہماری قوم کی تشکیل کرتے ہیں۔ لیکن جو ذمہ داریوں کا بوجھ اپنی گردن پر اُٹھانے کے بجائے خود اپنا بار جماعت کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ ایسے افراد ہیں جو "مزدور" کے گھر میں بیمار بن کر آئے ہیں۔ جو اُس کو امداد دینے کے بجائے، خود اُس کی امداد کے خواہاں ہیں۔ اور اس لئے "غریب مزدور" اگر دن میں تین پیسے کماتا تھا تو اب ان کی تیمارداری میں کچھ وقت صرف کرنے کے بعد اُسے دو پیسے ہی ملتے ہیں۔ اور پھر ان کی کفالت اس پر مستزاد!

یہ ایک ایسا بوجھ ہوتے ہیں جو قوم کی گاڑی کی رفتار کو تیز کرنے کے بجائے اُس کی رہی سہی رفتار کو بھی ختم کر کے رکھ دیتے ہیں۔

افراد سے جماعت بنتی ہے۔ یہی افراد رفتہ رفتہ ساری قوم پر چھا جاتے ہیں ـــ بلکہ چھائے ہوئے ہیں۔ اور ساری قوم کی ذہنیت غلامانہ ہو جاتی ہے۔ اُن کے اعضا تھک تھک کر گر پڑے ہیں۔ اُن کو محنت سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ اور دنیا کی کوئی ذلت بھی اُن کی حمیت و غیرت پر تازیانے لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

آپ اُن کے سامنے لاکھ تقریریں کیجئے۔ خطبے پڑھئے۔ مضامین پیش کیجئے۔ مگر جیسے دیوار سے باتیں کر رہے ہوں۔ بھینس کے آگے بین بجا رہے ہوں۔

پھر گھر کے اندر جائیے تو ہر عورت آپ کو کئی کئی امراض نسوانی کا بیک وقت شکار نظر آئے گی۔ اس لئے کہ "ولادت" سے پہلے اور اُس کے بعد اُن عورتوں کی نہ تو مناسب احتیاط ہو سکتی ہے۔ اور نہ ضروری غذا اُن کو ملتی ہے۔ اپنے شہر کے محکمۂ حفظانِ صحت کی رپورٹ دیکھئے۔ اور معلوم کیجئے کہ عورتوں میں امراض کا اوسط کیا ہے۔ اور یہ کہ ہر ہفتہ کتنی موتیں صرف "ولادت" سے واقع ہوتی ہیں۔

گاندھی جی کہتے ہیں:۔ "ہمیں جانباز سپاہیوں کی ضرورت ہے اس لئے "ضبط تولید" ہمارے لئے مضر ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک ہندوستان نے چار کروڑ "جانبازوں" کا اضافہ کیا۔ مگر نتیجہ؟ انڈیا بل؟

آپ کہیں گے انسانی فطرت کا گلا کیسے گھونٹیں۔ نوجوان لڑکیوں کو کہاں بٹھائیں۔ میں کہتا ہوں گلا تو آپ نے اب گھونٹ رکھا ہے۔ آپ کا ازدواج صرف یتیم بچے بنانے کی مشین ہے۔ بیوائیں پیدا کرنے کا آلہ ہے بے یار و مددگار بچوں کی آہ ہے اور سوسائٹی کے خون کا فوارہ!

جب آپ نے فطرت سے بغاوت کی ہے۔ جب آپ چڑیوں کی طرح نہیں رہ سکتے جنگلی جانوروں کی طرح بسر نہیں کر سکتے تو پھر اُسی طرح رہنے کی کوشش کیجئے جس طرح آپ کی "ضرورتیں" آپ کو مجبور کرتی ہیں۔ بار بار فطرت کا نام لے کر اپنے سر پر آرا کیوں چلاتے ہیں؟

پھر میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرے سے ازدواج ہی کو ختم کر دیا جائے۔ جن لوگوں میں صحت و توانائی ہے اور جو زندگی کی ضروری آسائیوں کے اعتبار سے اس کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ "بقائے نسل" کرتے رہیں۔ مگر یہ حشرات الارض کی طرح صرف تعداد اموات بڑھانے والے کیڑوں کی ضرورت نہیں۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایک روز سارا ہندوستان "گورغریباں" نہ بن جائے۔

ابوسعید بزمی ایم۔ اے

مکتوبات نیاز

۲۷/۲

آپ وہ باتیں کیوں لکھا کرتی ہیں جن کے جواب میں سوائے "احساس نارسائی" کے اظہار کے اور کچھ نہ کہہ سکوں

بہ حرف آمدی و زخم کہنہ ام نو شد
بہ حیرتم چہ نمک بود گفتگوئے ترا

آپ نے جس جرأت و جسارت سے ان کو جواب دیا ہے وہ اس سے زیادہ داد کا مستحق تھا جو آپ کو ملی۔ ممکن ہے آپ چھپاتی ہوں — آہ!

غزل میں اتنا شدید جذبۂ سپردگی و وارفتگی اور پھر اس پر آپ کا یہ کہنا کہ کسی سے آج تک محبت کی ہی نہیں، حیرت ہے

کفارہ کے سلسلہ میں آپ روزے بھی رکھیں گی اور مسکینوں کو کھانا بھی کھلائیں گی، خیر روزہ رکھنے میں تو کوئی حرج نہیں، اچھا ہے "رنگ کھلتا جائے گا جتنا کہ اڑتا جائے گا" لیکن دوسری بات بہت خطرناک ہے آپ نے ہندی کا دوہا نہیں سنا کہ "غربا کو غلہ تقسیم کرنے کی خدمت بہو کے سپرد کی گئی اس خیال سے کہ اس کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے ہیں خرچ کم ہوگا، لیکن وہاں ساری دنیا بھکاری بنکر جمع ہوگئی — یہاں تو مجھ سے زیادہ مسکین کوئی نہیں ہے، مگر مستحق بھی ہوں یا نہیں اس کا علم آپ کو ہوگا۔

اختر ریحانہ اور تصویر بدایونی سے میں واقف تک نہیں، خط و کتابت کی خوب کہی — ایک آپ ہی کی مہربانی تم ڈھانے کے لئے کیا کم ہے کہ کسی اور کی جستجو ہو۔

زنیرنگِ فسوں پردازی اُلفت چہ می پرسی
تو در آغوشی و من کشتۂ از دور دیدنہا

۲۷/۲

خط کا جواب ذرا تعویق سے جا رہا ہے، معافی چاہتا ہوں، آپ سے نہیں اُن سے جن کو ہر چند میں نے آپ کی وساطت سے جانا ہے لیکن معذرت براہ راست انھیں سے کرنا چاہتا ہوں، آپ کے اشعار سے آپ کا زور طبیعت

آپ کی بلند تخیل ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن غزل کے لئے جن جذبات سپردگی کی ضرورت ہے وہ ایک عورت کے کلام میں قدرتاً زیادہ قوی ہونا چاہئے۔ چنانچہ ہے۔ اُن سے کہدیجئے

اچھا ہے آپ قصیدہ خوانی کیجئے اور عزیز بانو زمزمہ سرائی۔ آپ دونوں خدمتیں انجام دینے پر اصرار نہ کیجئے ورنہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آپ کچھ نہیں کرنا چاہتے

ہائے ان کا اور آپ کا یہ تعلق کہ

بیداد تواں دید دستم گر نتواں گفت

کس قدر قابل رشک ہے، خوش رہئے

۴/۳

آپ عید کی مبارکباد دیتی ہیں حالانکہ

عید را در شہر ما رسم مبارکباد نیست

لفافہ کے اندر ایک چیز اور بھی ملی۔ بہتر ہے

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

میں جانتا ہوں کہ آپ سے دل آزاری ممکن نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ "شیوۂ دلداری" کبھی خود ایک مستقل آزار ہو جاتا ہے۔ ان کے لئے نہیں جو ہر وقت آپ کے ساتھ ہیں اور اس کے خوگر ہو چکے ہیں، بلکہ اُن کے لئے جو آزادی سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں"۔ تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

عزیز گرامی۔ آپ نے خوب کیا کہ جواب میں اتنے غیر معمولی سکوت سے کام لیا۔ نعمت غیر متوقعہ طور پر حاصل ہو تو زیادہ لطف آتا ہے۔

اس دوران میں آپ جن ذہنی حوادث سے دوچار ہوئے ہیں ان کا ہرچند مجھے علم حاصل نہیں اور نہ شاید پوچھنے کا حق۔ لیکن ان پر اظہار مسرت سے میں باز نہیں رہ سکتا کیونکہ غالباً بہ صورت دیگر آپ کی یہ خاموشی اور زیادہ طویل ہوتی۔ اللہ، اللہ جب تک آپ صرف پھول ہی پھول تھے اسوقت تک میرے لئے صرف ایک "ناشگفتہ عدم" بنے رہے اور اب کہ آپ کو کانٹوں میں کانٹا بنکر پہونچنا بھی آگیا ہے، مجھے اپنی شگفتگی کی خبر دیتے ہیں۔ آہ

چہ می کردیم یارب گر نبودے نار سید نہا

ہاں عید قربان گزر گئی اور شکر ہے کہ میرے دامن کو خون سے آلودہ کئے بغیر گزر گئی۔ میں غالباً ۱۳ اور ۱۶ کے درمیان کسی تاریخ میں آگرہ پہونچوں گا، آپ کا پتہ یادداشت کی کتاب میں درج کر لیا ہے۔ انشاء اللہ حاضر ہوں گا اور صرف وہ ایک چیز نذر میں طلب کرنے کے لئے جو "ماوراء کفر و ایماں" آپ کے پاس موجود ہے۔

عہد حاضر کے سیاسیات میں پٹرول کی اہمیت

جب گزشتہ جنگ اپنے شباب پر تھی اور فرانس پٹرول کی کمی کی وجہ سے نزع کے عالم میں تھا تو صدر جمہوریۂ فرانس (کلیمنسو) نے نہایت الحاح وزاری اور حد درجہ عالم اضطرار و اضطراب میں ولسن (پریسیڈنٹ امریکہ) کو تار بھیجا کہ "فرانس اس وقت صرف پٹرول کی مدد چاہتا ہے، جس کا ایک ایک قطرہ یہاں انسانی خون کے قطرہ سے زیادہ قیمتی ہے"۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پٹرول کتنی اہم چیز ہے اور حکومتوں کی زندگی کس حد تک اس تلخ و متعفن "آبِ حیات" پر منحصر ہے۔ پھر یہ اہمیت صرف جنگ ہی کے زمانہ میں محسوس نہیں کی جاتی بلکہ امن و سکون کے وقت بھی بدستور قایم رہتی ہے، کیونکہ تجارت و صناعت کے فنون اسی کے سہارے سے چل رہی ہیں۔ اسوقت سب سے قوی حکومت وہی ہے جو سب سے زیادہ معدنیات پٹرول پر قابض ہے اور سب سے بڑی تجارتی کمپنی وہی ہے جو پٹرول کے معدنیات میں کام کر رہی ہے۔ یوروپ کی ہر حکومت ہر وقت اس تاک میں لگی رہتی ہے کہ کہاں اُن کو پٹرول نظر آئے اور کب وہ اس پر جا کر قبضہ کریں۔ اس کے لئے دھوکے دئے جاتے ہیں، جھوٹ بولے جاتے ہیں، خوشامد کی جاتی ہے، دھمکیاں دی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اخلاق و انسانیت کے تمام اصول بالائے طاق رکھدئے جاتے ہیں اور اس "اکسیر حیات" کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔

سالگزشتہ میکزیکو میں جو بدامنی و بغاوت رونما ہوئی تھی اسکا حال اخباروں میں لوگوں نے پڑھا ہوگا، لیکن یہ بہت کم افراد کو معلوم ہوگا کہ اس کا سبب صرف پٹرول تھا۔ میکزیکو امریکہ کا وہ حصہ ہے جہاں پٹرول کی معدنیات بکثرت پائی جاتی ہیں اور یوروپ و امریکہ کی بڑی بڑی کمپنیاں رقیبانہ طور پر اس امر کی کوشش کر رہی ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ جائیں۔ لیکن چونکہ وہ اس میں بغیر حکومت کی مدد کے کامیاب نہیں ہو سکتیں، اس لئے اُن میں سے ہر ایک بیدریغ دولت اس کوشش میں صرف کر رہی ہے کہ حکومت اس کی طرفدار ہو جائے اور جب کوئی فریق اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو دوسرا بدامنی پیدا کر دیتا ہے اور حکومت پھر مجبوراً اسی کی طرف مایل ہو جاتی ہے۔ یہ تھا اصل سبب میکزیکو کی بدامنی کا — لیکن سوال یہ ہے کہ پٹرول کے لئے حکومتیں کیوں جان دیتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی مختصراً سمجھ لیجئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس عہد کی تمام تمدنی ترقیاں منحصر ہیں مشینوں پر اور ان کے چلانے کے لئے پٹرول سے زیادہ ارزاں، کارآمد اور محفوظ ایندھن کوئی نہیں۔

اس کا معدن سے نکالنا آسان، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اس سے زیادہ آسان۔ کمپنیوں کو صرف یہ کرنا پڑتا ہے کہ تیل کے کنوؤں میں پائپ لگا کر اس کو کھینچ لیتے ہیں اور پائپ ہی کے ذریعہ سے بندرگاہوں تک پہونچا دیتے ہیں۔ الغرض پٹرول کے نکالنے، صاف کرنے اور منتقل کرنے میں مصارف بھی بہت کم ہوتے ہیں اور آسانی بھی ہے۔ اس پر لطف یہ کہ اس سے جو قوت و حرارت پیدا ہوتی ہے وہ کویلہ سے دوچند ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب پٹرول کے چشموں میں کام کرنے والے بائیکاٹ کر دیتے ہیں تو تمام دنیا میں بے چینی پھیل جاتی ہے۔

پٹرول کا استعمال بھی روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے، جنگی و تجارتی جہازوں کے علاوہ ریلوں اور مشینوں کو بھی اس کے ذریعہ سے حرکت دیا جانا زیادہ پسند کیا جاتا ہے، موٹروں اور طیاروں کا حال سبھی کو معلوم ہے کہ پٹرول نہ ہو تو بیکار ہیں۔ امریکہ میں اکثر کارخانے اب صرف پٹرول کی قوت سے چل رہے ہیں اور ریلوں میں بھی بجائے کویلہ کے اس کا استعمال بڑھتا جاتا ہے۔ روس کا بھی یہی حال ہے۔

تجارتی و جنگی جہازوں میں پٹرول سے جو بچت ہوتی ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ بیک وقت پٹرول اور کویلہ سے چلنے والے دو جہاز علٰحدہ علٰحدہ لیجئے اور پھر دیکھئے کہ سہولت و مصارف میں کتنا فرق ہوتا ہے فرض کیجئے کہ یہ دونوں جہاز ۲۱ ہزار گھوڑوں کی قوت کے ہیں۔ تو سب سے پہلا نمایاں فرق دونوں کے وزن میں ہوگا کیونکہ دخانی جہاز اتنی قوت پیدا کرنے والا کم از کم ۴۰۰۰ ٹن کا ہوگا اور پٹرول سے چلنے والا صرف ایک ہزار ٹن کا۔ اسی طرح اب مصارف کے تفاوت کو دیکھئے کہ اول الذکر کو روزانہ ۳۶۰ ٹن کویلہ جلانا پڑیگا اور دوسرے کو ۱۰۰ ٹن پٹرول۔ اگر یہ دونوں پندرہ یوم کے سفر پر روانہ ہوں تو دخانی جہاز کے لئے ضروری ہوگا کہ ۵۴۰۰ ٹن کویلہ اپنے ساتھ رکھے جس کے لئے سات ہزار مکعب مٹر جگہ درکار ہوگی لیکن دوسرے کو صرف ۱۵۰۰ ٹن پٹرول کی ضرورت ہوگی جو ۱۷۰۰ مکعب مٹر جگہ میں آسکتا ہے۔ اس لئے دخانی جہاز مجبور ہے کہ پندرہ دن کے بعد کسی جگہ ٹھہر کر کویلہ بار کرے اس کے بعد چلے۔ لیکن دوسرا جہاز مسلسل ۲۷ دن تک چل سکتا ہے۔

جنگی جہازوں میں ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ دخانی جہازوں کا ان کے دھویں کی وجہ سے ۱۵ کلیومیٹر کے فاصلہ سے پتہ چل جاتا ہے اور پٹرول سے چلنے والے جہازوں کا پتہ دشمن کو اتنی دور سے نہیں چل سکتا کیونکہ اس سے دھواں بلند نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ چونکہ کویلہ کا وزن زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہ سست رفتار ہوتے ہیں، برخلاف پٹرول والے جہاز کے کہ وہ وزن کم ہونے کی وجہ سے زیادہ تیز چل سکتا ہے۔ علاوہ بریں ایک فرق

یہ بھی ہے کہ اول الذکر جہاز کو حرکت دینے میں گھنٹوں درکار ہوتے ہیں، کیونکہ کویلہ کا مشتعل ہونا، پانی کا کھولنا اور اس سے اتنی اسٹیم پیدا ہونا کہ سلنڈروں کو حرکت دے سکے کافی وقت چاہتا ہے، برخلاف دوسرے جہاز کے کہ وہ آدھ گھنٹے کے اندر روانگی کے لئے طیار ہوجاتا ہے اور اس کے بعد مزید آدھ گھنٹے کے اندر اپنی پوری رفتار حاصل کرلیتا ہے۔

اب دوسری آسانی کو دیکھئے کہ دخانی جہاز کو کویلہ سے بار کرنے کے لئے ۵۰۰ آدمی پانچ دن تک درکار ہوتے ہوتے ہیں لیکن پٹرول بھرنے کے لئے صرف ۱۲ گھنٹے اور بارہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوران سفر میں سمندر کے درمیان بھی جہازوں کو پٹرول سے بھر سکتے ہیں، لیکن دخانی جہاز اپنے ایندھن کے لئے کسی نہ کسی اسٹیشن تک پہنچنے پر مجبور ہیں۔

یہی سبب تھا کہ انگلستان و امریکہ نے سنہ ۱۲ء ہی سے اپنے اکثر جہازوں میں پٹرول کا استعمال شروع کردیا اور اب روس، فرانس و جرمنی ہر جگہ پٹرول ہی کی مدد سے جہاز رانی ہوتی ہے۔

گلہائے نیاز

ادب و انشا، کی دنیا میں، وہ چیز جس کی مثال آپ کو اردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات، شوخی و رنگینی، سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور انکی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات، کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۱۴ر
کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔ منیجر نگار- لکھنؤ

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا صرف پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کردئے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول ۸ر منیجر نگار- لکھنؤ

اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام

سرودِ زندگی

(مسلسل)

دیکھنے والے فروغِ رخِ زیبا دیکھیں　　پردۂ حسن پہ خود حسن کا پردہ دیکھیں

دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے کیونکہ اول تو "پردۂ حسن" کے استعمال کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی، دوسرا مصرعہ اول میں کہی ہوئی بات [illegible] "پردۂ حسن" کا تعلق ہوتا اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ یہاں "حسن زیرِ نقاب" ہی کا ذکر ہے تو پھر حسن کا پردہ کیا چیز قرار پائے گی جبکہ فروغِ رخِ زیبا مصرعۂ اول میں کھلم کھلا اس کے منافی واقع ہے اگر "حسن کا پردہ" کے بجائے "حسن کا جلوہ" لکھا جاتا تو خیر کچھ نہ کچھ مفہوم پیدا ہوجاتا ——— غالب کا شعر ہے:-

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

معلوم ہوتا ہے اصغر صاحب نے اسی شعر کو سامنے رکھ کر فکر فرمائی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ غالب کے شعر کا ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے اور اصغر صاحب نے "حسن کا پردہ" کہکر اس کو مہمل بنا دیا۔

جنونِ عشق میں ہستیٔ عالم پر نظر کیسی　　رخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

پہلے مصرعہ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جنونِ عشق میں دنیا کی "ہستی" کا خیال بھی نہیں رہتا۔ بالکل درست ہی لیکن دوسرے مصرعہ سے اس کا کیا تعلق۔ اگر ہستیٔ عالم کا جواب دوسرے مصرعہ میں رخِ لیلیٰ اور جنونِ عشق کا جواب نظارۂ محمل واقع ہوا ہے تو مفہوم کے لحاظ سے اس کا اہمال ظاہر ہے۔ یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا:-

دفورِ شوق ہو تو پردہ پھر کیسا کہ رکھتے ہیں　　رخِ لیلیٰ نظر میں اپنی، محمل دیکھنے والے

تماشا ہے نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا — میں انکا دل سمجھتا ہوں وہ میرا دل سمجھتے ہیں

اس شعر میں نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا تماشہ دکھایا گیا ہے۔ اور اس تماشہ کا ذکر دوسرے مصرعہ میں ہے جو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کس چیز کو شاعر ان کا دل سمجھتا ہے اور وہ کس چیز کو شاعر کا دل سمجھتے ہیں اس کا اظہار کہیں نہیں کیا گیا۔ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں محبوب کے دل کو زخمی سمجھتا ہوں اور وہ میرے دل کو، لیکن اسکو وہ ظاہر نہ کر سکے۔

کائنات دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے — زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

اول تو قضا کے سامنے زندگی کے مسکرانے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ شعر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مسکراہٹ استسلام و سپردگی کی تھی یا جحود و انکار کی، دوسرے روح الامیں کے بیہوش ہونے کا کیا موقعہ تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جسوقت روح الامیں پیام خداوندی شاعر کے سامنے لائے اسی وقت اتفاق سے قضا بھی آگئی اس لئے ادھر شاعر کی زندگی مسکرا پڑی اور ادھر روح الامیں غش کھا کر گر پڑے۔
کائنات دہر کی ترکیب بھی عجیب ہے۔ صرف کائنات کہدینا کافی تھا۔

رشکِ صد ایماں ہو اصغر میرا طرزِ کافری — میں خدا کے سامنے ہوں بت خدا کے سامنے

اگر "میں" اور بت دونوں خدا کے سامنے ہیں تو اس میں "رشکِ صد ایماں" ہونے کی کونسی بات ہے۔ اور وہ طرزِ کافری کیا تھا جس کی داد چاہی جاتی ہے۔

جلوہ ترا ابتک ہو نہاں چشم بشر سے — ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

پہلے مصرعہ میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ چشم بشر ابتک تیرا جلوہ نہیں دیکھ سکی اور دوسرے مصرعہ میں یہ خبر سنائی جاتی ہے کہ ہر ایک تجھے اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے اگر مصرعۂ اول کا دعوے صحیح ہے تو معنے یہ ہوں گے کہ دوسرے مصرعہ میں جن دیکھنے والوں کا ذکر ہے وہ انسان نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر وہ انسان ہوتے تو ظاہر ہے کہ چشم انسانی ہی سے دیکھتے!

مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے — یہ راز ہے تو ذرا حسنِ راز رہنے دے

پہلے مصرعہ میں اک خواہش و التجا کا اظہار ہے، کسی واقعہ کا ذکر نہیں، اس لئے مصرعۂ دوم میں لفظ یہ کا اشارہ بالکل بے محل ہے کیونکہ مشار الیہ نہ کوئی موجود ہے نہ اس کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ (یہ) کا اشارہ حقیقت کی طرف ہے تو پھر حسن راز کا اس سے کیا تعلق۔ راز کا حسن یہی ہے کہ وہ راز رہے اور یہاں حقیقت کو مجاز سے متعلق کرکے اس کا افشا چاہا جاتا ہے جس کو حسن سے کوئی واسطہ نہیں۔

حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے

دوسرے مصرعہ میں لفظ (یہ) بالکل زاید استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ اس کو حذف کرنے کے بعد بھی معنے پورے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلے مصرعہ میں لفظ تازہ بالکل بیکار ہے۔ محض حیات کہدینا کافی تھا۔ علاوہ اس کے مرحلہ کا دراز ہونا بھی کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ شعر یوں ہو سکتا تھا:۔

حیاتِ عشق ہے قائم اسی فسانہ پر فسانۂ غم اُلفت دراز رہنے دے

فسانہ کی تکرار اور زیادہ لطف پیدا کر دیتی۔

عکس کس چیز کا آئینۂ حیرت میں نہیں تیری صورت میں ہو کیا جو مری صورت میں نہیں

یہ شعر بھی منجملہ اُن بہت سے "تصوف زدہ" اشعار کے ہے جن کا لطف کسی ولی اللہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔

معشوق سے کہا جاتا ہے کہ میں جو تجھ کو دیکھ کر آئینۂ حیرت ہو گیا ہوں تو تیری صورت میری صورت ہو گئی ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ عاشق و معشوق دونوں کا ہمشکل ہو کر "توام نزاد" نظر آنا واقعۂ امکانی ہے تو اس کا غزل یا محبت سے کیا تعلق؟ اگر اس مسئلہ سے کسی کو دلچسپی ہو سکتی ہے تو کسی ماہر جنسیات کو یا عالم نیرنجات کو۔

ہو گئی جمع متاعِ غم حرماں کیونکر میں سمجھتا تھا کوئی پردۂ غفلت میں نہیں

یہاں غفلت سے مراد محبوب کی غفلت و بے پروائی ہے اس لئے یہ کیونکر سمجھ لیا گیا کہ پردۂ غفلت میں کوئی نہیں ہے۔ علاوہ اس کے لفظ (کوئی) سے متاعِ غم کا یوں بھی کوئی تعلق نہیں۔ اگر (کوئی) کی جگہ (کچھ) کہا جاتا تو خیر پہلے مصرعہ سے یک گونہ ربط پیدا ہو جاتا۔

تصوف کا ایک اور مسخ شدہ شعر ملاحظہ ہو:۔

عشق کی فطرت ازل سے حسن کی منزل میں ہے قیس بھی محمل میں ہے لیلیٰ اگر محمل میں ہے

وہاں تو غریب قیس کی ساری عمر گزر گئی اور پردۂ محمل تک پہونچنا نصیب نہ ہوا اور یہاں اصغر صاحب اس کو بالکل محمل کے اندر ہی لیلیٰ کے ساتھ ہم آغوش دیکھ رہے ہیں۔

عشق کی فطرت کا حسن کی منزل میں ہونا بھی عجیب بات ہے۔ منزل کی جگہ بھی فطرت لکھنا چاہئے تھا، لیکن شاید مطلع بنانے کے لئے شعر کو مہمل کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حسن کو پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

تصوف کی شاعری اول تو یونہی لغو و مہمل ہوتی ہے لیکن جب کھلم کھلا اس میں "مذہبیات" کی اصطلاحیں استعمال کی جائیں تو اس کا ابہام سخت نفرت انگیز ہو جاتا ہے۔ عرش ایک ایسا لفظ ہے جس کے صرف ایک ہی معنی لئے جا سکتے ہیں اور وہ معنی وہی ہیں جس کا تعلق مفروضہ عقاید مذہب سے ہے۔ اس لئے جو صوفی شعراء زیادہ پاکیزہ ذوق کے ہیں وہ ہمیشہ ایسے الفاظ سے احتراز کرتے ہیں اور زیادہ تر کنایہ سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اصغر صاحب جو لاہوت ایسا مکروہ و ثقیل لفظ استعمال کرنے سے احتراز نہیں کرتے ان پر عرش کا بار کیا ہو سکتا ہے۔

معنی کے لحاظ سے جس حد تک یہ شعر بیگانۂ تغزل ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ عشق کا اپنے ساتھ حسن کو لیجانا اور وہ بھی عرش کی منزل تک نجد و بوں کی دنیا کی بات ہے اور جب تک خود کوئی اسی حد تک بیگانۂ عقل و حواس نہ ہو جائے اس کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

اب انداز بیان کا نقص ملاحظہ کیجئے:۔ پہلے مصرعہ میں تو یہ خبر دی گئی تھی کہ عشق اپنے ساتھ حسن کو عرش تک لے گیا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ ذہن سامع کو آئندہ جستجو اسی کے متعلق پیدا ہوگی کہ وہ عرش کے بعد کہاں گیا۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں ذکر کیا جاتا ہے عشق کی منزل کا۔ میری رائے میں یہ شعر یوں ہوتا تو اتنے نقائص نہ پائے جاتے:۔

عرش تک تو ساتھ تھے دونوں مگر اب کیا خبر حسن کس منزل میں ہے اور عشق کس منزل میں ہے

اسی طرح کے اور چند عجیب و غریب اشعار ملاحظہ ہوں:۔

حسن بنکر خود کو عالم آشکارا کیجئے پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردہ کیجئے

دیکھنا ہوں میں کہ انساں کش ہے دریائے وجود خود حباب و موج بنکر اب تماشہ کیجئے

دے مسرت مجھے اور عین مسرت مجھ کو چاہئے غم بھی بہ اندازۂ راحت مجھ کو

یہ آنا جلوہ بنکر اور پھر میری نظر ہونا یہی ہے دید تو خود دید بھی اے فتنہ گر ہونا

جمال یار کی زینت بڑھا دی رنگ و صورت سے قیامت ہے قیامت میرا پابند نظر ہونا

طلسم رنگ و بو کو جس نے سمجھا مٹ گیا اصغر نظر کے لطف کا برباد ہونا ہے نظر ہونا

ذرہ ذرہ ہے یہاں کا رہرو راہ فنا سامنے کی بات تھی جس کو خبر سمجھا تھا میں

رقص مستی دیکھتے جوش تمنا دیکھتے سامنے لاکر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

اس طرح کچھ رنگ بھر جاتا نگاہ شوق میں جلوہ خود بیتاب ہو جاتا وہ پردہ دیکھتے

ترے قربان ساقی اب یہ کیا حالت ہے مستوں کی — کبھی عالم تو ہوتا ہے، کبھی عالم نہیں ہوتا

یہ اقرار خودی ہے دعویٔ ایماں دوں کیسا — ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

بہار جلوۂ رنگیں کا اب یہ عالم ہے — نظر کے سامنے حسنِ نظر مجسم ہے

جسم کو اپنا سا کر کے لے اڑی افلاک پر — اللہ اللہ یہ کمال روحِ جولاں دیکھئے

ایک میرا ہی فسانہ زازل تا بہ ابد — یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رسوا مجھ کو

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ہے اصغر — کیا خبر تھی وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

حوصلے عشق کے پامال ہوئے جاتے ہیں — اب یہ بیداد کہیں حسن پہ بیداد نہ ہو

اب نہ یہ میری ذات ہے اب نہ یہ کائنات ہے — میں نے نوائے عشق کو ساز سے یوں ملا دیا

عکس جمال یار کا آئینۂ خودی میں ہے — یہ غم ہجر کیا دیا مجھ سے مجھے چھپا دیا

یہ تمام اشعار نہ صرف یہ کہ تغزل سے خالی ہیں بلکہ مفہوم سے بھی یکسر بیگانہ ہیں۔ چند مفروضات پر ان کی بنیاد قایم ہے اور اس دنیا کے محسوسات و تاثرات سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ دعویٰ خواہ کتنا ہی لغو کیوں نہ ہو لیکن اگر شاعر اپنی تخیل کے زور سے اس کو ثابت کر دے تو شعر حسن پارہ ہو جاتا ہے، لیکن اصغر صاحب نے کبھی اس کی زحمت گوارا نہیں کی اور یہ شاید ان سے ممکن بھی نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاعر کا کمال یہی ہے کہ چند خوبصورت الفاظ کو ایک جگہ جمع کر دے۔ نہ اس کو محل استعمال سے بحث ہونا چاہئے اور نہ اس سے کہ ان سے کوئی مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ چونکہ فلسفہ و تصوف کی شاعری میں اس کی کافی گنجایش ہے اس لئے اصغر صاحب جو اپنی فطرت کے لحاظ سے "گم گو" قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں بالطبع اسکی طرف مایل ہیں، لیکن چونکہ تخیل ان کی خود اپنی نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ فن شعر و بیان و معانی سے ناواقف ہیں اس لئے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتے اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ محض لایعنی دعوے پیش کر دینا ہی کمال شاعری ہے، ثبوت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی کی اس متصوفانہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے جو صرف احمد جام ژندہ پیل اور شاہ نیاز احمد بریلوی کے لئے مخصوص ہے اور اس سے آگے بڑھنے کا حوصلہ انھیں کبھی نہیں ہوا۔ فارسی میں اس رنگ کا سب سے زیادہ دقیق کہنے والا بیدل گزرا ہے اور ایسی ایسی باتیں اس نے لکھی ہیں جو بظاہر بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ اس کا سارا کلیات چھان ڈالئے کوئی ایک شعر بھی ایسا نہ نکلے گا جس میں اس نے کوئی دعوے بغیر ثبوت کے کیا ہو۔

آئینہ - خودی - حجاب - دریا - حباب - ساز - پردہ - وغیرہ نہایت عام الفاظ ہیں جن پر تصوف کی شاعری کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اصغر صاحب نے بھی تقلیداً انھیں سے کام لیا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ

بیدل نے اُن کے متعلق جو مضامین پیش کئے ہیں وہ خود اس کے ذاتی ہیں اور اصغر نے جو کچھ لکھا ہے وہ تقلید ہے، اسی لئے اس کے یہاں وسعت مفہوم و شگفتگی ہے اور یہاں اہمال و ضغط۔

دوسرا حصہ اصغر صاحب کے کلام کا وہ ہے جس میں کوئی مفہوم تو ہے لیکن کوئی نہ کوئی نقص اس میں ضرور پایا جاتا ہے مثلاً:۔

سازِ دل کے پردوں کو خود وہ چھیڑتا ہو جب　　جانِ مضطرب بنکر تو بھی لب کشا ہو جا

اس شعر میں ساز، پردہ اور اس کو چھیڑنے والا سب مجازی معنے میں استعمال ہوئے ہیں اس لئے جانِ مضطرب کی جگہ اضطراب جاں زیادہ موزوں تھا۔

یہی نگاہ جو چاہے وہ انقلاب کرے　　لباس زہد کو جس نے کیا شراب آلود

پہلے مصرعہ میں بیان کی تعقید و تشویش ظاہر ہے۔ لفظ (وہ) بالکل زاید مستعمل ہوا ہے اور (انقلاب کرنا) محاورہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح لفظ (یہی) سراسر بے محل آیا ہے اس کی جگہ (تری) ہونا چاہئے تھا۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا:۔

تری نگاہ جو فتنہ کرے بپا، کم ہے

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا　　خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

دوسرے مصرعہ میں بجائے (جس کو) کے صرف (کہ) استعمال ہوا ہے جو درست نہیں۔ یہ مصرعہ یوں درست ہو سکتا ہے:۔

ہے اپنا طرزِ نظر جس کو دیکھتا ہوں میں

حسن کرشمہ ساز کا بزم میں فیض عام ہے　　جانِ بلاکشاں بھی آج غرق ہے موجِ نور میں

موجِ نور کے استعمال کا کوئی قرینہ شعر سے ظاہر نہیں۔ پہلے مصرعہ میں حسنِ کرشمہ ساز لکھا ہے اور موج نور کو اس سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرح فیض عام کے زیر اثر جان بلاکشاں کو موج سرور و مسرت میں غرق ہونا چاہئے نہ کہ موج نور میں (آج) کا (ج) بھی تقطیع سے گرتا ہے۔ بجائے اس کے (ب) ہونا چاہئے۔

موجوں کا عکس ہے خطِ جامِ شراب میں　　یا خوں اچھل رہا ہے رگِ ماہتاب میں

خطِ جام ایک فرضی خط ہے اور اگر فرضی نہ ہو تو بھی اس میں موجوں کا عکس نمایاں نہیں ہو سکتا۔ دوسرے

مصرعہ میں جامِ شراب کو (ماہتاب) کہا ہے حالانکہ (آفتاب) کہنا زیادہ مناسب تھا۔

اس دن بھی میری روح تھی محوِ نشاط دید موسیٰ الجھ گئے تھے سوال و جواب میں

پہلے مصرعہ کے انداز بیان کے لحاظ سے دوسرے مصرعہ کے ابتدا میں (جب) ہونا چاہیئے تھا۔ جب، موسیٰ سوال و جواب میں الجھے ہوئے تھے۔ لہٰذا (جب) کا اظہار ضروری ہے اور (الجھ گئے تھے) بھی بے محل استعمال ہوا ہے۔ یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے:۔

اس دن بھی میری روح تھی محوِ جمالِ جب
موسیٰ الجھ رہے تھے سوال و جواب میں

میں اضطرابِ شوق کہوں یا جمالِ دوست اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

تھوڑی سی تبدیلی سے بعد یہ شعر اس سے بہتر ہو سکتا تھا:۔

میں اس کو فرطِ شوق کہوں یا جمالِ دوست
اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

بخانۂ ازل میں جہانِ خراب میں ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

پہلے مصرعہ میں لفظ (نہ) دونوں ٹکڑوں کے درمیان لانا نامناسب تھا اور دوسرے مصرعہ میں (ایک جگہ) کی بجائے (کسی جگہ) ہونا چاہیئے تھا۔ دوسرا مصرعہ یوں ہو سکتا ہے:۔

ٹھہرا گیا نہ مجھ سے کہیں اضطراب میں

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کس کو گلستاں بنا دیا؟ سوائے (کلیوں) کے اور کسی کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا اور (کلیوں) کو گلستاں بنا دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ اس کے لب کشائی کا نتیجہ (گلستاں بنا دینا) بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ (غزلخواں) ہوتا تو خیر تعلق پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ نقص پھر بھی باقی رہتا کہ کس کو غزلخواں بنا دیا۔

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

پہلے مصرعہ میں (اس) بالکل غیر ضروری ہے۔

بلبل بہ آہ و نالہ و گل مست رنگ و بو مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

پہلے مصرعہ کے دونوں ٹکڑے ترکیب کے لحاظ سے غیر متوازن ہیں - علاوہ اس کے (بلبل بہ آہ و نالہ) کی ترکیب بھی اس موقعہ پر صحیح نہیں ہے - بجائے اس کے (بلبل رہینِ نالہ) کہہ سکتے تھے -

---

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے

اگر امتحان و آزمایش میں عاشق رونے لگا تو اس سے خود معشوق کا اپنے آپ کو آزما بیٹھنا کیونکر ظاہر ہوتا ہے - اور اس سے معشوق کی آزمایش کیا ہوئی - یہ شعر اس طرح درست ہو سکتا ہے

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو
کیا ملا انھیں آخر، مجھ کو آزمانے سے

زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اُٹھاتا ہوں مجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

زخم لینا خلافِ محاورہ ہے - (زخم آپ کھاتا ہوں) ہونا چاہئے -

سرو بھی جو بہار بھی لالہ و گل بہار بھی جس سے چمن چمن بنا ایک وہ مشت پر نہیں

پہلے مصرعہ میں ٹکڑوں کی تقسیم غلط ہے (گل) کے بعد (بھی) ہونا ضروری تھا اور اس کے نہ ہونے سے (گل بہار کے ساتھ ملکر گلبہار ہو جاتا ہے - دوسرا مصرعہ بھی سست ہے - یہ شعر یوں ہونا چاہئے :-

سرو بھی جو بہار بھی، گل بھی ہے اور بہار بھی
جس سے مگر چمن بنا اک وہی مشت پر نہیں

جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے اے شعبدہ پرواز یہ کیا طرزِ نظر ہے

شعر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جینے مرنے کا ہوش کسے نہیں ہے، محبوب کو یا عاشق کو - اس لئے پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے

جینے کا مجھے ہوش نہ مرنے کی خبر ہے

ہے تابشِ انوار سے عالم تہ و بالا جلوہ وہ ابھی تک تہ دامانِ نظر ہے

نہ تابشِ انوار سے عالم تہ و بالا ہو سکتا ہے اور نہ جلوہ کا دامانِ نظر سے کوئی تعلق ہے - اگر یہ کہا جاتا کہ " وہ جلوہ

ابھی تک زیرِ نقاب ہے" تو البتہ درست ہو سکتا تھا۔

ذرہ ذرہ پھر بنے گا اک جہانِ رنگ و بو چپکے چپکے ہو رہا ہے عہد و پیمانِ بہار

عہد و پیمانِ بہار کس سے ہو رہا ہے یا کون بہار سے عہد و پیمان کر رہا ہے اس کا ذکر کسی جگہ نہیں ہے حالانکہ ضروری تھا

در پہ جو تیرے آگیا اب نہ کہیں مجھے اُٹھا گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

پہلا مصرعہ ترکیب نظم کے لحاظ سے بہت سُست ہے علاوہ اس کے گردشِ مہر و ماہ کا ذکر بھی بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے۔ اصغر صاحب نے جو مفہوم پیدا کرنا چاہا ہے اس کے لحاظ سے شعر یوں ہونا چاہئے تھا:۔

بات نصیب کی ہے یہ در ترا مجھ کو مل گیا گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھی ہے ورنہ راہ میں

تو بہت سمجھا تو کہہ گزرا فریبِ رنگ و بو یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہ ناز ہے

دوسرے مصرعہ میں لفظ (لیکن) کا استعمال صحیح نہیں ہوا اس جگہ (ورنہ) ہونا چاہئے۔

بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا اب تو ہیں بھی ہم اسیروں کو پر پرواز ہے

ذوقِ رہائی اور رہائی میں بڑا فرق ہے اس لئے جب تک پہلے مصرعہ میں واقعتاً رہائی نہ دکھائی جائے، دوسرے مصرعہ میں یہ دعوے کر بیٹھنا کہ قفس بھی پر پرواز ہو گیا ہے درست نہیں ہو سکتا۔

عام ہے وہ جلوہ لیکن اپنا اپنا طرزِ دید میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

پہلے مصرعہ میں لفظ عام کے استعمال کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ بجائے اس کے (ایک) کا لفظ زیادہ برمحل ہے۔

دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا ہونا

پہلے مصرعہ میں لفظ (سے) نمایاں کے ساتھ تو استعمال ہو سکتا ہے لیکن پنہاں کے لئے (میں) چاہئے۔ اس لئے یہ مصرعہ اس طرح ہونا چاہئے تھا:۔

دہر ہی سے وہ نمایاں ہے، اسی میں پنہاں

دوسرے مصرعہ کی ردیف بالکل بیکار ہے کیونکہ (ہونا) کو حذف کر دینے کے بعد بھی معنی پورے ہو جاتے ہیں۔

جلوۂ ذوقِ پرستش، گرمیِ حسنِ نیاز ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

اس شعر میں بھی (ردیف) بیکار ہے اور (ہے) حذف کرنے سے مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ علاوہ اس کے معنوی نقص یہ ہے کہ کعبہ کے لئے جلوۂ ذوق پرستش لائے ہیں اور بتخانہ کے لئے گرمیِ حسنِ نیاز، حالانکہ نیاز و پرستش میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے جو کعبہ و بتخانہ ایسی دو متضاد چیزوں کے امتیاز کو ظاہر کر سکے۔

اسی کے ساتھ لفظ حسن کا استعمال بھی ذوق کے مقابلہ میں درست نہیں حسب ذیل تغیر سے یہ شعر بلند ہو سکتا ہے:۔

ذوقِ خالص ہی یہاں، واں ذوق کی جلوہ گری
ورنہ کچھ کعبہ میں رکھا ہے نہ بتخانے میں ہے

ہے تقاضا ترے جلوہ کی فراوانی کا ہمہ تن دید بنیں تجھ کو سراپا دیکھیں

دوسرے مصرعہ کا کوئی ایک ساٹکڑا مفہوم پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دونوں میں ربط اس لئے نہیں ہے کہ سراپا دیکھنے کے لئے ہمہ تن دید بننا بالکل غیر ضروری ہے۔ علاوہ اس کے جلوہ کی فراوانی تو اس امر کی مقتضی ہے کہ ہمہ تن دید بننے کے بعد بھی تکمیل نظارہ نہ ہو سکے۔ لفظ تقاضا بھی بے محل استعمال کیا گیا ہے — میرا مشورہ اس شعر کے متعلق یہ ہے:۔

ہے یہ عالم ترے جلوہ کی فراوانی کا
ہمہ تن دید بھی بن کر بھی نہ سراپا دیکھیں

ساقیا جام بکف پھر ہو ذرا گرم نوا حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضا دیکھیں

پہلے مصرعہ میں ساقی سے خطاب کرکے دو باتوں کی فرمائش کی جاتی ہے ایک یہ کہ جام بکف ہو اور دوسرے یہ کہ گرم نوا ہو حالانکہ لفظ (ہو) صرف ایک جگہ واقع ہے خواہ اس کو جام بکف سے متعلق کیجئے یا گرم نوا سے، جام بکف ساقی کی صفت ہو نہیں سکتی کیونکہ حرفِ ندا اس کے بعد موجود ہے۔ اگر ساقی جام بکف کہا جاتا تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

عبث ہے دعوئے عشق و محبت خامکاروں کو یہ غم دیتے ہیں جسکو جوہر قابل سمجھتے ہیں

دوسرا مصرعہ مفہوم کے لحاظ سے ناقص ہے کیونکہ (یہ غم) کے بعد جب تک (اُسے) کا اضافہ نہ کیا جائے معنی پورے نہیں ہوتے۔

(باقی)

باب الاستفسار

آدم اور شجرۂ ممنوعہ

(جناب خلیق ٹلہری - کوئٹہ)

میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا اگر میرے اس استفسار کا جواب آپ مارچ کی اشاعت میں مرحمت فرمائیں گے۔

حضرت آدم کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ انھوں نے گیہوں کھایا اور اُس کی پاداش میں جنت سے نکالدئے گئے۔ قرآن کریم میں جہاں تک میرا خیال ہے اس قصہ کے متعلق صرف اتنا ذکر ہے:-

"وقلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ وکلا منہا رغداً حیث شئتما ولا تقربا ہذہ الشجرۃ فتکونا من الظٰلمین ۵ فازلہما الشیطٰن عنہا فاخرجہما مما کان فیہ وقلنا اہبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین"

کیا جناب اس مسئلہ پر صراحت کے ساتھ روشنی ڈالیں گے کہ وہ درخت کس چیز کا تھا اور شجرۂ گندم کس روایت سے شہرت پاگیا۔ نیز یہ کہ وہ کونسی جنت تھی جہاں سے آدم کا اخراج ہوا۔ اگر وہ جنت اس کرۂ ارض سے علحدہ نہ تھی تو "لکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین" کی تخصیص کیسی۔

(نگار) اگر نگار آپ کے مطالعہ میں رہتا ہے تو آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ کلام مجید کے باب میں ہمیشہ میں نے دو باتوں پر زور دیا ہے۔ ایک یہ کہ اس کو خود اسی سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے اور دوسرے یہ کہ اگر تفاسیر و احادیث کا مطالعہ بھی اس سلسلہ میں کیا جائے تو عقل و درایت کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا چاہئے کیونکہ یہ بھی بہرحال دماغ انسانی ہی کی پیداوار ہیں اور سہو و نسیان، لغزش و غلطی بلکہ تحریف و خدع سے بھی پاک نہیں ہوسکتیں۔

اسلام اور تعلیمات اسلام کی سادگی و پاکیزگی کو جس چیز نے تباہ کیا ہے وہ صرف مجموعہ احادیث ہے، کیونکہ

تفاسیر کی بنیاد یکسر حدیثوں ہی پر قائم ہے اور تفسیروں ہی کو دیکھ کر لوگ قرآن پاک سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔
آدم کے متعلق جو فسانہ اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اس کے خاص خاص ٹکڑے یہ ہیں :-

۱- آدم نام اس مخصوص فرد نوع انسانی کا ہے جو سب سے پہلے مٹی سے تعمیر کیا گیا اور جنت میں رکھا گیا۔
۲- ان کے پہلو سے حوا ان کی بیوی پیدا کی گئیں
۳- تمام ملائکہ نے انھیں سجدہ کیا لیکن ابلیس نے نہیں کیا اور اسی لئے وہ جنت سے نکالا گیا۔
۴- شیطان سانپ اور طاؤس کی مدد سے چھپ کر جنت میں پہونچا اور حوا کو بہکایا کہ آدم کو گیہوں کھانے پر آمادہ کریں۔
۵- آدم نے گیہوں کھایا اور اس جرم میں وہ معہ حوا کے جنت سے نکال کر نیچے زمین پر پھینکدئے گئے

یہ تمام باتیں جو عام طور پر مشہور ہیں صرف ان غلط روایات کا نتیجہ ہیں جنھیں احادیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جن کو کلام مجید سے زیادہ اعتماد حاصل ہے۔ ورنہ خود کلام پاک میں کسی جگہ ان لغویات کا ذکر نہیں ہے۔
قرآن میں آدم کا قصہ آٹھ جگہ بیان ہوا ہے اور ان تمام آیات کے مطالعہ سے صرف حسب ذیل باتیں محقق ہوتی ہیں :-

۱- خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ یا آدم پیدا کرنا چاہا۔
۲- ملائکہ نے مخالفت کی کہ وہ سوائے خونریزی کے اور کچھ نہ کرے گا
۳- خدا نے آدم کو علم اسماء سکھایا اور ملائکہ اپنے تئیں اس باب میں عاجز پاکر سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا
۴- آدم اور ان کی بیوی کو جنت میں رہنے کا حکم ملا اور شجرۂ ممنوعہ کے پاس جانے کی ممانعت کر دی گئی
۵- لیکن شیطان نے انھیں بہکایا اور وہ جنت سے نکالدئے گئے

اس بحث میں چند امور قابل غور ہیں :- آدم سے مراد کیا ہے — ملائکہ اور ابلیس کا کیا مفہوم ہے — شجرۂ ممنوعہ سے کس چیز کو تعبیر کیا گیا ہے اور جنت سے نکالدئے جانے کا کیا مطلب ہے۔
جن لوگوں نے آدم سے کوئی خاص شخص مراد لیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے، کیونکہ خود کلام مجید ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آدم سے مراد نوع انسانی ہے ملاحظہ ہو سورۂ ص ارشاد ہوتا ہے :-

اذ قال ربک للملائکۃ انی خالق بشراً من طین فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین۔

یہاں بھی وہی خلق آدم کا قصہ بیان ہوا ہے لیکن بجائے لفظ (آدم) کے (بشر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔
اس لئے اگر تفسیر قرآن بالقرآن کو پیش نظر رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ آدم سے مراد کوئی مخصوص ہستی نہیں ہے۔

بلکہ ساری نوع انسانی مقصود ہے۔ جب یہ امر متحقق ہوگیا تو اب اس افسانہ کا رنگ ہی دوسرا ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں ملائکہ کا سوال و جواب، شیطان کا جحود و انکار، آدم کا شجرۂ ممنوعہ کے پاس جانا اور جنت سے نکالا جانا سب بیان و استعارہ و کنایہ میں داخل سمجھا جائے گا۔ اس لئے اب دریافت طلب امر صرف یہ رہجاتا ہے کہ اس انداز بیان سے فی الحقیقت کیا ظاہر کرنا مقصود ہے۔

جن لوگوں نے ملائکہ سے کوئی خاص مخلوق (نوری، پردار) سمجھی ہے انھوں نے صرف عہد جاہلیت کے عقاید کا تتبع کیا ہے، کیونکہ ظہور اسلام سے قبل عام طور پر فرشتوں کے متعلق یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک خاص قسم کی مخلوق ہے جو آسمان سے زمین تک تگ و دو میں مصروف رہتی ہے اور دیویوں اور دیوتاؤں کی کارکن جماعت ہے۔ حالانکہ ملائکہ سے صرف وہ قوتیں مراد ہیں جو کائنات میں بروئے کار نظر آتی ہیں اور بعض اکابر اسلام نے نہایت وضاحت سے اس کو ظاہر کیا ہے۔ اس لئے جب ملائکہ سے مراد صرف قوار عالم ہیں تو ظاہر ہے کہ ابلیس عبارت ہوگا صرف اس قوت سے جو بدی کی طرف مایل کرتی ہے اور لفظ شجر استعارہ ہوگا عدوان و بغاوت یا شر و فساد سے، کیونکہ جس طرح ایک درخت کی شاخیں پھوٹتی ہیں اسی طرح بدی کے اثرات بھی وسیع ہوتے ہیں۔

خود کلام مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شجر سے مراد شجر معصیت ہے۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں آدم کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

"فوسوس الیہ الشیطان قال یا آدم ہل ادلک علی شجرۃ الخلد و ملک لا یبلیٰ"۔

اس میں معصیت کو شجرۃ الخلد اور لازوال مملکت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھکر نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے ان آیات میں صرف فطرت انسانی سے بحث کی ہے اور تنبیہ کی ہے کہ اگر انسان نے اپنی قوت تمیز سے کام نہ لیا تو اس کا گمراہ ہوکر برکات فطرت سے محروم ہو جانا یقینی ہے۔

خدا کا آدم کو علم اسماء سکھانا اور ملائکہ کا سجدہ میں گر پڑنا اشارہ ہے اس طرف کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان تمام قوار عالم کو اپنے قابو میں لے آسکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ ابلیس کا ذکر کرکے گویا یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ باوجود ان تمام اقتدارات کے انسان کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات اپنی خواہشات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو سخت نقصان پہونچا لیتا ہے۔

اسلامی لٹریچر میں جو تمام حشو و زواید نظر آتے ہیں وہ یہودیوں کی روایات سے ماخوذ ہیں۔ کیونکہ توریت میں بھی آفرینش آدم کا قصہ تقریباً اسی انداز میں بیان کیا گیا ہے لیکن یہود نے اس کو بھی مسخ کرکے پیش کیا اور چونکہ وہ لوگ اس کو حقیقتاً ایک واقعہ سمجھتے تھے اس لئے مسلمان راویوں نے بھی انھیں کی پیروی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اب یہ خیال اسقدر سختی کے ساتھ دلنشیں ہوگیا ہے کہ اس کا دور کرنا آسان نہیں۔

مطبوعات موصولہ

صحیفۂ ادب

جناب شیخ عبدالرحمان طارق منشی فاضل کی تصنیف ہے جو مشتمل ہے فن شاعری کی حقیقت پر اور ایک بسیط تنقید بر فن میرزا غالب کے دیوان اردو پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پہلے عرض حال کے سلسلہ میں اس تصنیف کے اسباب تخلیق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جابجا بالکل بلاضرورت عربی مقولے اور آیات قرآنی استعمال کرکے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف عربی زبان سے بھی واقف ہے۔ جابجا اشعار کا صرف بھی آورد و تصنع سے خالی نہیں ہے اور انداز تحریر میں ایک خامکارانہ پندار پایا جاتا ہے جو نہ کانوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے، نہ ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ باب اول میں شاعری کی حقیقت پر تقریباً تمام ان مسایل کو لے لیا گیا ہے جو ایک سرسری نگاہ کے تحت میں آسکتے ہیں اور جن پر اس سے قبل بارہا خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ گفتگو کے دوران میں اساتذہ کے اشعار بھی شاہد و سند کے طور پر پیش کئے ہیں جو چنداں اقتضاء محل کے خلاف تو نہیں ہیں لیکن ضرورت سے زیادہ یقیناً ہیں۔

اس کے بعد دوسرے باب میں مرزا کی اردو شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور عشق و تصوف، اخلاق و فلسفہ، شوخی و محاکات، موسیقی و ترنم اور صنائع و بدائع سبھی کچھ ڈھونڈھ ڈھونڈھکر نکالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن زیادہ تر رجحان جیسا کہ انھوں نے خود ہی ابتدا میں ظاہر کیا ہے اس فیصلہ کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ:۔ "غالب مشرق کا ایک نہایت ہی بلند پایہ فلسفی اور ماہر نفسیات ہے" مدعا یہ کہ وہ غزل کہنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو لیکن فلسفہ ضرور جانتا ہے۔

غزل میں فلسفہ و تصوف کی بدعت کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن اس کو تغزل کا صحیح معیار قرار دینا یہ حال ہی کی ذہنیت ہے جو مغرب کی ناقص تعلیم سے ہمارے نوجوانوں میں پیدا ہوئی ہے۔ نفسیات داں ہونا کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے جو غالب یا کسی اور کے لئے طرۂ امتیاز قرار دیجائے، بچہ جو ماں کی گود میں کھیلتا ہے وہ بھی نفسیات سے واقف ہوتا ہے اور ایک فاتر العقل دیوانہ بھی اس سے نابلد نہیں ہوتا۔ رہا فلسفہ سو اسکی حقیقت بھی اس سے زاید نہیں ہے کہ وہ "کسی چیز کی نسبت کچھ نہ جاننے" کا دوسرا نام ہے نہ حقایق و مسلمات

سے اسے کوئی واسطہ، نہ حرکت وعمل سے اسے کوئی تعلق۔ اس لئے اگر ایسی بیکار چیزوں سے منسوب کرکے غالب کا مرتبہ بلند کیا جاتا ہے تو بالکل " مالا یرضی بہ الشاعر" کے قبیل کی چیز ہے۔

غالب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کوئی فلسفی تھا اس کی حد درجہ توہین ہے اور نفسیات دانی اس سے متعلق کرنا اس کو احمق بنانا ہے۔ وہ شاعر تھا اور نہایت اچھا شاعر تھا لیکن صرف اس لئے کہ اسے معشوق سے وہ باتیں کرنا آتی تھیں جو ایک عاشق کے لئے موزوں ہیں نہ اس لئے کہ وہ معمائے حیات یا عقدۂ کائنات کا حل کرنے والا تھا جب وہ کسی محبوب سے ملنے کی دعا مانگتا تھا تو "شوقِ وصل وشکوۂ ہجراں" دونوں۔ کے اظہار کی تمنا دل میں رکھتا تھا اور پورا حق تغزل ادا کرتا تھا۔ لیکن جب وہ " اصل شہود وشاہد ومشہود" کا مہمل نظریہ بیان کرنے لگتا تھا تو وہ مرتبۂ شاعری سے بالکل گر جاتا تھا۔ اس لئے میرے نزدیک غالب کے کلام پر فلسفہ وتصوف کے نقطۂ نظر سے بحث کرنا، اس کی " رندی وشاہد بازی" پر جو تغزل کی صحیح محرک ہے ناقابل برداشت اتہام لگانا ہے۔

البتہ طارق صاحب نے اس عنوان وخیال سے ہٹ کر جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے ضرور اتفاق ہے اور میں غالب کو اس سے زیادہ تعریف کا مستحق سمجھتا ہوں جو انھوں نے کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مصنف نے اس کتاب کی ترتیب میں کافی محنت سے کام لیا ہے، لیکن چونکہ یہ انکی بالکل پہلی کوشش ہے اس لئے ژولیدگی بیان سے پاک نہیں اور حسنِ استدلال کے فقدان کے ساتھ ایک ایسا تصنع اپنے اندر رکھتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لکھنے والا غالب سے زیادہ اپنی قابلیت لوگوں سے تسلیم کرانا چاہتا ہے۔

طباعت وکتابت کے لحاظ سے کتاب بہت پسندیدہ ہے اور ایک روپیہ آٹھ آنے میں دار التالیف ہندیکی دروازہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

ابرِ ماطرِ روح مجموعہ ہے جناب حاجی محمد عبد الغفور صاحب کے کلام کا جو مشتاق وشوق دو تخلص رکھتے ہیں ابتدا میں چند قصاید حمد ونعت اور منقبت کے ہیں اور اس کے بعد چند نظمیں تصوف کے رنگ کی ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

سرورِ جہل میں عرفان وعلم ہیں مفقود — بروزِ کیف ہے اندازۂ فریب شہود
ہے ذرہ ذرۂ دار فنا جہانِ فنا — کہ ہر وجود میں ہے عالم عدم موجود
مناظر نظری یا مکاشف جگری — تمام جلوے نیاز جمال بے خبری
میں نے دنیا کو کیا نور یقیں سے روشن — خالق پردۂ ظلماتِ توہم ہوں میں

ممکن ہے اربابِ نظر ان اشعار کو نہایت بلند سمجھتے ہوں، لیکن میں ان کو بالکل لغو ومہمل کہتا ہوں۔

غزلیات میں بھی یہی رنگ غالب ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

یہ راز نہاں بھی دم سجدہ نظر آیا — حیرت ہے عجب شان سے بندہ نظر آیا
چھایا ہوا ہر سمت مرا کیف نظر تھا — پردہ جو اٹھایا بھی تو پردہ نظر آیا
ہے خلوت دل میں بھی وہی شان حیا کی — پردہ میں بھی آخر مجھے پردہ نظر آیا

کیا دیکھے بحجاب ترا جلوۂ جمال — اٹھتا نہیں ہے آنکھ سے پردہ نگاہ کا
چشم بد دور رہے کیا خاک شدہ دل میرا — رکھتے ہیں اہل نظر آنکھ میں حاصل میرا
اس حسن پہ چھایا ہے مرا حسن نظر بھی — معلوم نہیں ہے کہ نہیں تم کو خبر بھی

یہ صاحب اس وقت الہ آباد ہی میں موجود ہیں جہاں اصغر صاحب کا قیام ہے اور ہر چند انھوں نے اپنی شاگردی کے متعلق کچھ نہیں لکھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح اصغر صاحب ہی سے لیتے ہیں، ورنہ یہ انداز بیان اور مسایل تصوف پر اتنا عبور حاصل ہونا یوں ممکن نہ تھا۔

یہ عجیب و غریب مجموعۂ نظم غیر مجلد ایک روپیہ میں مہدی علی خاں کتب فروش چوک الہ آباد سے ملسکتا ہے۔

مختصر تاریخ ادب اردو اس کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے اور چونکہ اس کے مصنف سید اعجاز حسین صاحب۔ ام۔ اے خود الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے لکچرر ہیں اس لئے جو کچھ لکھا گیا ہے "بہ شیوۂ کار آگہاں" لکھا گیا ہے۔ "کار آگہی" اس لحاظ سے بھی کہ جس شخص کی نسبت جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر لکھا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ جو نہیں لکھا ہے وہ بھی سوچ سمجھ کر نہیں لکھا۔

ہر چند ایک نقاد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ نکتہ چینی بھی ضرور کرے لیکن خلاف حقیقت کسی کی بے جا ستائی بھی اس کا فرض نہیں ہے۔ سید سلیمان ندوی کی شگفتگی تحریر و علمی تحقیق کا ذکر کرنے میں وہ بالکل حق بہ جانب تھے لیکن اسی کے ساتھ یہ لکھنے پر کس نے مجبور کیا کہ وہ کورانہ تقلید سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اصغر صاحب کے کلام میں حقایق و معارف کا ذکر کر سکتے تھے لیکن یہ فیصلہ کرنا کیا ضرور تھا کہ ان سے اردو ادب کے ذخیرہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اعجاز صاحب نے اچھا کیا کہ اس کتاب میں کسی کا ذکر برائی سے نہیں کیا، اور نہ کسی جگہ خشونت کا اظہار کیا الا صاحب گل رعنا کے خلاف کہ انھوں نے کیوں آبحیات پر نکتہ چینی کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر طلبہ کو اسی روداد پر فیصلہ کرنے کے لئے مجبور کیا گیا تو ان میں صحیح ذوق نقد کیونکر پیدا ہو سکے گا۔

اس کتاب کے دو حصے ہیں ایک شعراء کے لئے مخصوص ہے اور دوسرا نثر نگاروں کے لئے۔ شاعروں میں انھوں نے خسرو سے لیکر ظریف تک سب کو لے لیا ہے اور نثر نگاروں میں میر امن سے لیکر علی عباس حسینی

تک کسی کو نہیں چھوڑا۔

حالات کے استقصاء میں بھی انھوں نے بخل سے کام نہیں لیا ہے اور جس حد تک مناسب سمجھا ہے نمونۂ کلام بھی پیش کر دیا ہے۔

یہ کتاب اعجاز صاحب نے صرف طلبہ کے لئے لکھی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس مقصد کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس کی قیمت عہ ہے اور مصنف یا انڈین پریس الہ آباد سے ملسکتی ہے۔

حدیث حسن جناب فطرت واسطی کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو مختلف رسایل میں شایع ہوئی ہیں۔ ابتداء میں اقبال احمد سہیل کا مقدمہ ہے اور اس کے بعد چند اہل نظر کی رائیں ہیں، جن میں ایک بے بصر حرف میں ہی ہوں۔ فطرت کے کلام سے قارئین نگار ناواقف نہیں اس لئے اس پر زیادہ کہنے کی گنجایش نہ ضرورت۔

فطرت کی شاعری میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے کہ انھیں معارف وحقایق لکھنے کا شوق نہیں ہے، وہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے تاثرات کے تحت میں لکھتے ہیں اور آسمان وزمین کے قلابے ملانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے یہاں ندرت بھی کافی پائی جاتی ہے اور سلاست وحلاوت بھی۔ یہ مجموعہ ایک روپیہ میں شاہکار بک ڈپو گورکھپور سے ملتا ہے۔

الہامی افسانے اس کتاب کے مصنف جناب مرتضیٰ احمد خانصاحب ہیں۔ اور اشاعت اس کی تاج کمپنی لمیٹیڈ لاہور کی ہے جو خاص سلیقہ کے ساتھ کتابیں شایع کرنے میں بہت مشہور ہے۔

اس کتاب کا موضوع صرف ان واقعات کو پیش کرنا ہے جن کا ذکر تفصیلی یا اجمالی کلام مجید میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے حصہ میں ہابیل وقابیل، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان اور حضرت یونس کا حال بیان کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں اُن حوادث کا ذکر ہے جو گمراہ قوموں پر عذاب کی صورت سے نازل کئے گئے۔ چنانچہ طوفان نوح، آل فرعون کی غرقابی، اصحاب فیل کی تباہی وغیرہ کا ذکر اس حصہ میں پایا جاتا ہے۔

قطع نظر اس سے کہ ان قصص وحکایات کی حقیقت کیا ہے اور تفتیش وتحقیق کا فیصلہ ان کی صحت وعدم صحت کے باب میں کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اخلاقی نصائح کی ان میں کمی نہیں اور اس لئے ان کا مطالعہ فایدہ سے خالی نہیں۔

فاضل مولف نے جس زبان میں جس انداز سے ان کو بیان کیا ہے وہ اسقدر دلکش، اس درجہ لطیف و موثر ہے کہ ان کو پڑھکر واقعی افسانہ کا سا لطف آنے لگتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ الفاظ اکثر مشکل و دقیق استعمال کئے گئے ہیں لیکن چونکہ مقصود بھی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اس کتاب کا مطالعہ کریں اس لئے یہ چنداں حرج بھی نہیں رہتا ہے۔ کتاب کی قیمت کسی جگہ درج نہیں ہے لیکن ڈیڑھ دو روپیہ سے کیا کم ہوگی۔

نکہت رائگاں مسٹر لطیفی لودہیانوی بی۔ اے کے چند چھوٹے چھوٹے ادبی مقالات کا مجموعہ ہے جنمیں سے بعض نثر میں ہیں اور بعض طبع زاد۔ لطیفی صاحب ادعائے مہدویت کے سلسلہ میں (جس سے انھیں خدا جانے کیوں انکار ہے) کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بہت ذہین واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے لئے ایک الگ جگہ بنالی ہے اور مجھے امید ہے کہ جب وہ جوانی کے طوفان سے گزر کر سن وقوف تک پہونچیں گے تو وہ خود اپنے رنگ سخن میں اتنی تبدیلی پیدا کرلیں گے کہ نہ مجھے لکھنے کی ضرورت ہوگی نہ کسی اور کو۔

قیمت درج نہیں ہے۔ لیکن جو حضرات اس کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ ادارۂ مطبوعات شاطو دیکفیلڈ گنج لودہیانہ سے طلب کر سکتے ہیں۔

ذکر نبی اس کے مؤلف جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے مختصراً رسول اللہ کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جنھوں نے ان کو ایک انسان اعظم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ کتاب کی زبان صاف و سلیس ہے اور سچے جوش سے لبریز۔ بارہ آنے میں مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

موازنۂ صلیب و ہلال تالیف ہے جناب نکہت شاہجہانپوری بی۔ اے کی جو صحیح معنے میں عہد حاضر کے معیار تصنیف پر پوری اترتی ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے ازبس مفید و کارآمد ہے۔ یہ کتاب اسلامی تمدن و حضارت کی مختصر لیکن نہایت جامع تاریخ ہے جس میں ایک ترقی کرنے والی یا ترقی یافتہ قوم کے جملہ اکتسابات و اختراعات کو پیش نظر رکھکر داد تحقیق دی گئی ہے۔

مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں علوم و فنون کی جتنی خدمت کی ہے وہ ارباب تاریخ سے پوشیدہ نہیں شاید اس کا تفصیلی علم بہت کم حضرات کو حاصل ہوگا کہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو جس یوروپین تمدن و سیاست سے واسطہ پڑا وہ کیا تھا اور مشرق و مغرب کے اس اتصال تہذیب سے کون کس درجہ متاثر ہوا۔ نکہت صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس پہلو کو سامنے رکھکر لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خوب لکھا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر وہ شخص جسکو

تاریخ سے دلچسپی ہے اس کا مطالعہ کرے۔ اس کی قیمت بہ ہے اور فاضل مولف سے بہ وساطت انجمن اسلام ہارنبائی روڈ فورٹ بمبئی ملسکتی ہے۔

عروس ادب مجموعہ ہے جناب ظرافت دہلوی کے چودہ افسانوں کا جو مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ ظرافت صاحب منجملہ اُن چند افسانہ نگاروں کے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے پلاٹ کی وضع و ترکیب سے قصے کہانیوں میں بھی واقعاتی رنگ بھر دیتے ہیں اور اسی لئے پبلک میں بہت مقبول ہیں۔ جیسا کہ شاہد صاحب نے اپنے تعارف میں ظاہر کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ ہر افسانہ پڑھنے کے قابل ہے اور کسی ایک فسانہ کا پڑھ لینا گویا ساری کتاب کو ختم کر دینے پر مجبور ہو جانا ہے، وہ لوگ جو واقعی لائٹ لٹریچر (تفریحی ادب) کے شایق ہیں، ان کے لئے اس مجموعہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ ساقی بکڈپو دہلی۔

گنجینۂ معرفت منظوم ترجمہ ہے بھگوت گیتا کا جسے راج کشور صاحب احقر جایسی نے مرتب کیا ہے۔ بھگوت گیتا دنیا کے اُن چند مخصوص صحایف میں سے ہے جو اپنے قبول و شہرت کے لحاظ سے الہامی کہے جاتے ہیں اور اس لئے اس کا مطالعہ بین الاقوامی تعلقات استوار کرنے کے لئے ضروری ہے۔

نومتو اس کا ترجمہ اس سے پہلے بھی اُردو میں ہو چکا ہے لیکن مثنوی کے انداز سے لکھنے کی کوشش کسی نے نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ نظم کا میدان ترجمہ کی دقتوں کو دیکھتے ہوئے بہت محدود ہے لیکن احقر صاحب نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ اصل کتاب کے مطالب کا احاطہ کر لیں۔ فن شعر یا نظم کے لحاظ سے نہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہ گنجایش کیونکہ ایسی کتابیں نہ فنی حیثیت سے پیش کی جاتی ہیں نہ اس نقطۂ نظر سے ان پر تبصرہ مناسب ہے۔ یہ کتاب ایک روپیہ میں مترجم سے مڈل اسکول تیلوئی (اودھ) سے ملسکتی ہے جہاں وہ ہیڈ ماسٹری کی خدمت پر مامور ہیں۔

مکتوبات امجد سید احمد حسین صاحب امجد کے چند مکتوبات ہیں جنہیں ان کے شاگرد مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے شایع کیا ہے۔ جناب امجد حیدر آباد کے مخصوص سخنوروں میں شمار ہوتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ سادہ رباعیاں لکھنے میں بہت مشہور ہیں۔

ان کی نثر نگاری کا کوئی خاص کارنامہ ہمارے سامنے نہیں آیا تھا۔ اب ان خطوط نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔ خطوں کا انداز بھی سادگی کے لحاظ سے بالکل ان کی رباعیوں کی طرح ہے اور کوئی خاص بات قابل اعتنا ان میں نہیں پائی جاتی۔ یہ کتاب ۸۰ر میں شمس المطابع عثمان گنج حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

محمد مصطفیٰ دو جزو کا چھوٹی تقطیع پر نہایت ہی مختصر رسالہ ہے جو آنسہ زہرا بیگم دختر محمد حسن صاحب انجینیر اٹاوہ نے مرتب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۳۲ صفحات میں اس موضوع پر کیا لکھا جا سکتا ہے تاہم اس

لحاظ سے کہ ایک خاتون نے غزل اور افسانوں سے ہٹ کر ایک کام کی بات پر وقت صرف کیا ہے، قابل قدر ہے۔ بچوں اور عورتوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا اور شاید انھیں کے لئے یہ رسالہ لکھا بھی گیا ہے۔ قیمت ۲ر ہے اور ملنے کا پتہ :۔ بچوں کا کتب خانہ ۵ کلا یورو ڈ نئی دہلی۔

مثنویات تصنیف ہے جناب محمد امیر احمد صاحب علوی بی اے کی موضوع نام سے ظاہر ہے۔ فاضل مصنف کا ایک مضمون اس موضوع پر نگار کی جنوری ۳۵ء کی اشاعت میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اب اسی مضمون کو زیادہ بسط کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ اُردو کی مثنویوں میں ایسا جامع مضمون اس سے قبل میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ اور اگر ہو بھی تو وہ زبان اس میں نہ ہوگی جو جناب امیر علوی کی انشاء کی خصوصیت ہے۔ یہ کتاب ۱۲ر میں امیر محل لائبریری کاکوری (لکھنؤ) سے ملسکتی ہے۔

مطالعۂ حدیث یہ تالیف جناب سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے کی ہے اور تکمیل ہے اس مضمون کی جو نگار میں شایع ہو رہا تھا اور جس پر ملک میں کافی ہنگامہ میرے اور ان کے خلاف برپا کیا گیا۔ ابتدا میں مولانا اسلم جیراجپوری نے ترتیب احادیث اور ان کی اہمیت پر اظہار خیال کیا ہے جو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہے اس کے بعد اصل تالیف شروع ہوتی ہے جس میں تدوین احادیث پر نظر ڈالتے ہوئے اسرائیلیات، زندیقیت، دجال، معراج، قتل مرتد، غلامی، اوقات نماز، ایام صیام اور زکوۃ کے متعلق تمام احادیث پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

یہ بات اب راز نہیں رہی کہ اسلام کو جس چیز نے غارت و برباد کیا ہے وہ صرف مجموعۂ احادیث ہے جس نے مسلمانوں سے درایت کی اہلیت چھین کر ذہنی غلامی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لئے اس نوع کی تصانیف کا رواج یا نا حقیقتاً مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے ــــ ہر چند مجھے بعض مقامات پر مصنف علام کی تحقیق سے اختلاف ہے لیکن ان کی نیت کی صداقت مجھے ہر جگہ تسلیم ہے۔ یہ کتاب ۴ر میں دفتر بلاغ امرت سر سے ملسکتی ہے۔

تنقید الاحادیث تالیف ہے جناب محمد عباس صاحب طالب صفوی کی جو صرف خاندان کے لحاظ سے شیعہ ہیں لیکن مذہب کی حیثیت سے یکسر آزاد خیال۔ جمع احادیث کے باب میں جو بے راہ روی اہل تسنن کے یہاں اختیار کی گئی وہی حضرات شیعہ کے یہاں بھی پائی جاتی ہے اور اس کتاب میں فاضل مصنف نے اسی کی طرف توجہ کی ہے۔

اس میں تقیہ، مسایل حلال و حرام، نکاح و طلاق، خلع و متعہ وغیرہ متعدد مسایل پر شیعی احادیث کو سامنے رکھ کر ایسی بے لاگ و منصفانہ رائے دی ہے کہ اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ وہ حضرات جو مقبول احمد صاحب کی تصنیف مطالعۂ احادیث کو دیکھیں ان کے لئے اس کا مطالعہ بھی ازبس ضروری ہے۔

یہ کتاب فاضل مولف سے شمس آباد (فرخ آباد) کے پتہ پر ملسکتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

اعتبارات

انار

ایک بار انار کے قلب میں مجھے رہنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے سنا کہ اس کا ایک دانہ کہہ رہا ہے " ایک دن آنے والا ہے کہ میں زبردست درخت ہوں گا، ہوائیں میری شاخوں کے اندر سے گزر رہی ہوں گی، آفتاب کی کرنیں میرے پتوں پر چمک رہی ہوں گی اور میں فرط مسرت سے جھوم رہا ہوں گا"

دوسرے دانہ نے جواب دیا " یہ سب تمھارا خیال ہی خیال ہے، جب میں تمھاری طرح بچہ تھا تو میں بھی یہی خواب دیکھا کرتا تھا، لیکن جب میں ہر چیز کو اس کے صحیح مقیاس و معیار سے سمجھنے کے قابل ہوا تو پتہ چلا کہ یہ تمام تمنائیں لغو و دور از کار تھیں"

تیسرا دانہ بولا ۔ " یقیناً کسی مستقبل عظیم کی توقع بیکار ہے"

چوتھے دانہ نے کہا ۔ " اگر ہمارا مستقبل اتنا حقیر و تاریک ہے تو ہماری موجودہ زندگی بیکار ہے"

پانچواں دانہ بولا ۔ " مستقبل کے متعلق یہ نزاع بالکل بیکار ہے جبکہ ہم کو اپنے حال ہی کی خبر نہیں"

چھٹا دانہ بولا ۔ " میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم ہمیشہ وہی رہیں گے جو اس وقت ہیں"

ساتویں دانہ نے کہا ۔ " میرے ذہن میں تو مستقبل کی صورت واضح ہے لیکن افسوس ہے کہ میں اسے الفاظ سے ظاہر نہیں کر سکتا"

اس کے بعد آٹھویں، نویں اور دسویں دانے نے کچھ کہا اور پھر تمام دانوں نے ملکر ایک ایسا ہنگامۂ گفتگو پیدا کر دیا کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

میں نے انار کی سکونت اسی دن ترک کر دی اور سیب کے اندر رہنے لگا اور چونکہ اس میں گنتی کے چند دانے تھے اس لئے میں زیادہ سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔

رات اور مجنون

مجنون ۔ " اے رات میں بھی تیری ہی طرح تاریک و عریاں ہوں۔ میں ایک آتشین راستہ پر چل رہا ہوں جس کے اوپر میرے دن کے خواب چھائے ہوئے ہیں اور جب میرے پاؤں زمین کو چھوتے ہیں تو وہاں سے ایک زبردست و

قوی شاہ بلوط نمودار ہو جاتا ہے

رات ۔ "نہیں، اے مجنون، تو میری طرح نہیں ہے، کیونکہ تو ریگ زار پر اپنے نشانات قدم اب بھی دیکھنا چاہتا ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات میں بھی تیری ہی طرح خاموش و عمیق ہوں۔ میرے قلب میں ایک دیوی بستی ہے اور وہ ایک ایسے مولودِ سماوی کو اپنے بطن میں لئے ہوئے ہے جس میں دوزخ و جنت دونوں کا اقتران ہے۔"

رات ۔ "نہیں، اے مجنون تو میری طرح نہیں ہے، تو اب بھی آلام و مصائب کے سامنے کانپ اٹھتا ہے اور بادیہ کی آواز سب تجھے لرزہ براندام کر دیتی ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات میں بھی تیری ہی طرح ابدی و صاحب جبروت ہوں میرے کانوں میں غلام قوموں کی آہ و بکا گونج رہی ہے اور ویران ممالک پر میرا دل حسرتوں سے لبریز ہے۔"

رات ۔ "نہیں، اے مجنون، تو میری طرح نہیں ہے کیونکہ تو ہنوز اپنی چھوٹی سی ہستی کو اپنا وفادار رفیق بنائے ہوئے ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات، میں بھی تیری ہی طرح ظالم و متکبر ہوں۔ میرا قلب بھی اسوقت تک خوش نہیں ہوتا جب تک سمندروں میں آتش زدہ جہازوں کے شعلوں کو نہ دیکھوں اور میرے ہونٹوں کے لئے اگر کوئی لذت ہے تو صرف ان بہادروں کے خون میں جو میدان جنگ میں تڑپ رہے ہوں۔"

رات ۔ "نہیں، تو ہرگز میری طرح نہیں ہے۔ کیونکہ تجھ پر ہنوز تیرا شوق مسلط ہے اور وہ تجھے جہاں چاہتا ہے لیجاتا ہے، خود تیرے نفس نے کوئی التفا تیرے لئے پیدا نہیں کی۔"

مجنون ۔ "اے رات میں بھی تیری ہی طرح عیش و طرب کا دلدادہ ہوں، جو شخص میرے ساتھ رہتا ہے وہ ہر وقت نشہ میں سرشار رہتا ہے اور ہر وہ عورت جو میری رفیق ہوتی ہے گناہ کرنے کے بعد مسرور نظر آتی ہے۔"

رات ۔ "نہیں تو میری طرح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تیری روح تہ بہ تہ بہت سے پردوں میں چھپی ہوئی ہے اور تیرا قلب تیری ہتھیلی پر نہیں ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات میں بھی تیری ہی طرح ملول و حزیں ہوں۔ میرے سینہ میں بھی بہت سے مخلص لوگوں کی یاد مدفون ہے۔"

رات ۔ "کیا واقعی تو میری طرح ہے۔ کیا تو بجلی کی تلوار ہاتھ میں لیکر آندھیوں کو اپنا مرکب بنا سکتا ہے۔"

مجنون ۔ "اے رات میں تیری ہی طرح ہوں، تیری ہی طرح قدرت رکھتا ہوں، اور جب زمانہ میرے سامنے سے گزرتا ہے تو میرے دامن کو بوسہ دیتا ہوا گزرتا ہے۔"

رات ۔ "کیا تو میری طرح ہے۔ اے میرے سیاہ و تاریک قلب سے پیدا ہونے والی ہستی، کیا تو واقعی میری ہی طرح ہے کیا تجھے میرے ناقابل احاطہ افکار کا علم ہے اور کیا تو میری وسیع زبان میں گفتگو کر سکتا ہے؟"

مجنون ۔ "ہاں، اے رات ہم تم دونوں توام بھائی بہن ہیں اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ تو لا نہایت کے رازوں کی مفسر ہے اور میں اپنے نفس کے رازوں کا شارح۔"

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اسکی تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سرت عروج و زوال موت حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشگوئی کر سکتا ہے

قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بمثیل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت علاوہ محصول ۱۲

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲۔ مادیین کا مذہب

۳۔ حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت (۱۲ر) علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کی تاریخ تمدن اسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے

قیمت (۸ر) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جسمیں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تہذیب و شائستگی اسکی کسقدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنفہ کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔

صحابیات

اسمیں عہد سعادت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دئے گئے ہیں اسکا مقدمہ جسے مؤلف نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے دیکھنے کے قابل ہے اس موضوع پر اور کتابیں بھی ہیں مگر اتنی صحابیات کے حالات کسی کتاب میں درج نہیں کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ ۸ر علاوہ محصول۔

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفےٰ کامل پاشا کی اس مشہور عالم کتاب کا ترجمہ ہے جسنے یورپ و ایشیا کی سیاسیات میں ہلچل ڈالدی تھی اور جسنے سب سے پہلے ترکی و مصر عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونک کر عالم اسلامی کے درخشاں مستقبل کو بے نقاب کر دیا تھا۔

قیمت عہ علاوہ محصول۔

عرض نغمہ

یعنی ٹیگور کی گیتان جلی کا سب سے پہلا اردو ترجمہ جسکے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کی رائے تھی کہ دنیا کی کسی زبان میں گیتان علی کا ترجمہ اس سے بہتر نہیں کیا گیا! اسکے شروع میں ایک نہایت ہی دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے قیمت غیر مجلد عہ علاوہ محصول۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

شاہی

تیار کردہ

طیبی

دواخانہ

یونانی

شاہی

تیار کردہ

طیبی

دواخانہ

یونانی

ملیریا اور ٹائیفائیڈ (موتی جھرہ)

کے بعد کمزوری دفع کرنے کیلئے

"شاہی"

لاجواب دوا ہے

اینیمیا (کمی خون) دمہ

کھانسی و جملہ امراض

سینہ کے لئے

"شاہی"

اکسیر علاج

ہے

ہسٹریا اور اسقاط حمل

کے

دفع کرنے میں

"شاہی"

کا مقابلہ کرے ایسی

دوا شاذ و نادر

ہی ہو

مزید معلومات کے لئے

ہفت رنگین رسالہ مفت طلب کیجئے

طیبی دواخانہ یونانی

اندور (مالوہ)

تار کا پتہ :- "شاہی" اندور

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳